TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222426
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳۱۴ - س ۰ خ Accession No. ۱۶۱۰۸

Author سردار جعفری 016108

Title خون کی لکیر ۱۹۴۹ء

This book should be returned on or before the date last marked below.

خون کی لکیر

۵۴

خون کی لکیر

سردار جعفری

نو ہند پبلشرز لمیٹڈ۔ بمبئی ۲
کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

طبع اول
سنہ ۱۹۴۹ء

۱۶۱۰۸

جملہ حقوق محفوظ

قیمت
تین روپیہ
آٹھ آنے

بیجناتھ نائر نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ سے چھپوا کر
"نو ھند پبلشرز لمیٹڈ" ۳۰۱ عبدالرحمٰن اسٹریٹ بمبئی ۳ سے شائع کیا

فہرست

۱	انتساب	۹
۲	معذرت	۱۱
۳	ایک شعر	۱۳
۴	تمہید	۱۵
۵	ایک جھلک	۱۷
۶	غم کا ستارہ	۱۸
۷	غزل	۱۹
۸	حُسنِ سوگوار	۲۰
۹	تذبذب	۲۳
۱۰	حُسن ناتمام	۲۶
۱۱	لکھنو کی ایک شام	۲۸
۱۲	خیر مقدم	۳۰

۱۳	اکیلا ستارہ	۳۲
۱۴	سرمایہ دار لڑکیاں	۳۳
۱۵	مزدور لڑکیاں	۳۶
۱۶	انتظار نہ کر	۳۹
۱۷	عہد حاضر	۴۱
۱۸	ایک سوال	۴۲
۱۹	نیا زمانہ	۴۳
۲۰	گھڑی بہت کٹھن ہے	۴۴
۲۱	اختلاف رائے	۴۵
۲۲	ٹوٹا ہوا ستارہ	۴۶
۲۳	وہم و خیال	۴۸
۲۴	غالب	۵۳
۲۵	موت اور زندگی	۵۶
۲۶	نئی شاعری	۶۰
۲۷	بغاوت	۶۲
۲۸	جوانی	۶۴
۲۹	سماج	۶۸

۳۰	سالِ نو	۷۰
۳۱	آتشیں ستارہ	۷۲
۳۲	جنگ اور انقلاب	۷۴
۳۳	سامراجی لڑائی	۷۷
۳۴	ایک خط	۷۹
۳۵	موت	۸۰
۳۶	رہائی	۸۴
۳۷	انقلابِ روس	۸۷
۳۸	تاجکستان کا ایک گیت	۹۰
۳۹	تعمیرِ نو	۹۲
۴۰	لینن	۹۵
۴۱	آخری خط	۹۷
۴۲	جبر	۱۰۷
۴۳	عظمتِ انساں	۱۱۰
۴۴	شاعر	۱۱۵
۴۵	گوالیار	۱۱۸
۴۶	بمبئی کے ملاحوں کی بغاوت	۱۲۱

۴۷	گردِ کارواں	۱۲۵
۴۸	خود پرستی	۱۲۸
۴۹	چلمنیں اٹھتی ہیں	۱۲۹
۵۰	قطعات	۱۳۰
۵۱	یہ بھی تو دیکھ	۱۴۷
۵۲	خواب	۱۴۹
۵۳	فریب	۱۶۳
۵۴	آنسوؤں کے چراغ	۱۶۹
۵۵	کشاکش	۱۷۷
۵۶	غزل	۱۸۱
۵۷	تشنگانہ	۱۸۴
۵۸	غزل	۱۹۰
۵۹	غزل	۱۹۲
۶۰	سیلابِ چین	۱۹۶
۶۱	جیل	۲۱۱
۶۲	جشنِ بغاوت	۲۱۳
۶۳	رومان سے انقلاب تک	۲۱۶

سُلطانہ کے نام

سردار جعفری نے وعدہ کیا تھا کہ خون کی لکیر کا پیش لفظ وہ خود لکھیں گے۔ لیکن حکومت بمبئی نے پبلک سیفٹی آرڈیننس کے تحت ان کو گرفتار کر لیا۔ مجبوراً یہ کتاب پیش لفظ کے بغیر شائع کی جا رہی ہے۔

ناشر

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

غالبؔ

تمہید

زندگانی کی اندھیری رات میں
درد اور دُکھ کی بھری برسات میں
لے کے اک ماہِ تمام آیا ہوں میں
میکشو آتش بجام آیا ہوں میں
میرے پیمانے میں گُم ہے کائنات
میرے میخانے میں صہبائے حیات
میرے آئینے میں عکسِ صبحِ نَو
آفتابِ عہدِ آزادی کی ضَو
شہسوارِ گردشِ ایّام ہوں
انقلابِ وقت کا پیغام ہوں
ہے مری چشمِ تخیّل پر عیاں
اک نئے میلادِ آدم کا سماں

تاکہ ہو آسان پیکارِ حیات
کر رہا ہوں فاش اسرارِ حیات

اب جرس کو حکمِ خاموشی نہیں
کارواں میں خود فراموشی نہیں

حسنِ معنیٰ ہو رہا ہے بے نقاب
اٹھ رہے ہیں استعاروں کے حجاب

آشکارا تیغ کا جوہر ہے آج
کسوتِ مینا سے باہر ہے آج

خون پیمانوں میں اب ڈھلتا نہیں
اب امیری کا فسوں چلتا نہیں

زلزلہ ہے ظلم کی بنیاد میں
تہلکہ ہے قصرِ استبداد میں

دم بخود ہیں قیصر و فغفور آج
تیز تر ہے نغمۂ جمہور آج

حلقۂ زنجیر گلنے ہی کو ہے
زندگی کروٹ بدلنے ہی کو ہے

ایک جھلک

صرف لہرا کے رہ گیا آنچل
رنگ بن کر بکھر گیا کوئی
گردشِ خوں رگوں میں تیز ہوئی
دل کو چھو کر گذر گیا کوئی
پھول سے کِھل گئے تصوّر میں
دامنِ شوق بھر گیا کوئی

غم کا ستارہ

میری وادی میں وہ اک دن یوں ہی آنکلی تھی
حُسن اور نور کا بہتا ہوا دھارا بن کر
محفلِ شوق میں اک دُھوم مچا دی اُس نے
خلوتِ دل میں رہی انجمن آرا بن کر
شعلۂ عشق سرِ عرش کو جب چھونے لگا
اُڑ گئی وہ مرے سینے سے شرارا بن کر
اور اب میرے تصوّر کا افق روشن ہے
وہ چمکتی ہے جہاں غم کا ستارا بن کر

غزل

حسن کی رنگین ادائیں کارگر ہوتی گئیں
عشق کی بے باکیاں بے باک تر ہوتی گئیں

یاں مری بہکی ہوئی نظریں بہکتی ہی رہیں
واں نگاہیں اور بھی کچھ معتبر ہوتی گئیں

زندگانی اپنے نشتر آزماتی ہی رہی
اُن کی نظریں نخبر چاکِ جگر ہوتی گئیں

لب پہ ہلکے سے تبسّم کی مٹھاس آتی گئی
زندگی کی تلخیاں شیر و شکر ہوتی گئیں

آرزوئیں نارسائی کا گلہ کرتی رہیں
اور وہ زُلفیں زینتِ دوش و کمر ہوتی گئیں

حسنِ سوگوار

کیا کہوں کیا ہے وہ حُسنِ سوگوار
جس کو نظریں دور سے کرتی ہیں پیار
خال و خد میں رس نگاہوں میں شراب
مہکی مہکی سانس میں روحِ گلاب
انکھڑیوں میں خواب و بیداری لئے
زلف کے ہر خم میں دلداری لئے
بات کرتی ہے تو یوں جھڑتے ہیں پھول
جیسے گلشن میں بہاروں کا نزول
ہو کے چپ جب بیٹھ جاتی ہے کبھی
خامشی سے پھوٹتی ہے راگنی

آنکھ اُٹھا کر دیکھ لیتی ہے اگر
جم کے رہ جاتی ہے سورج کی نظر
پھر بھی ہے رُخ پر اُداسی کا غبار
جس طرح پھولوں پہ شبنم کی پھوار
آسماں پر شام کی پرچھائیاں
آئینے پر ہلکی ہلکی جھائیاں
صبح کے منظر پہ کُہرے کا اثر
ابر کی چادر عروسِ ماہ پر
ادھ کھلے مخمور آنکھوں کے کنول
ابروؤں کی نوک پر ہلکا سا بل
قہقہوں میں گریۂ غم کی خراش
انگلیوں میں ایک مبہم ارتعاش
شوق کی برنائیوں سے بیقرار
عشق کی ناکامیوں سے سوگوار

رسم کی زنجیر میں جکڑی ہوئی
حلقۂ تقدیر میں جکڑی ہوئی

لاکھ چاہے پھر بھی خوش رہتی نہیں
دل میں کڑھتی ہے مگر کہتی نہیں

ہنستے ہنستے جیسے کھو جاتی ہے وہ
بات کرتے کرتے سو جاتی ہے وہ

سوچ کر کچھ ڈبڈبا آتی ہے آنکھ
چھپکے چھپکے اشک برساتی ہے آنکھ

روتے روتے مسکرا دیتی ہے پھر
دل میں شمعیں سی جلا دیتی ہے پھر

اس کی خوشیاں جتنی غم انگیز ہیں
اس کے غم اتنے ہی دل آویز ہیں

تذبذب

آج تو شوق کے ساحل پہ کھڑی ہے خاموش
موج کا رقصِ جنوں پاس بلاتا ہے تجھے
ریت پر گذرے ہوئے عہد کا ہر نقشِ قدم
ایک بھولا ہوا افسانہ سُناتا ہے تجھے
تھپکیاں دے کے سُلا دیتی ہے ساحل کی ہوا
اور اُٹھتا ہوا طوفان جگاتا ہے تجھے
ڈوبتی شام کے ماتھے کا چمکتا تارا
زندگانی کا نیا خواب دکھاتا ہے تجھے
شب کا بڑھتا ہوا پر ہول سیہ رنگ فسوں
اک الم ناک اندھیرے سے ڈراتا ہے تجھے

بحر کی سطحِ حسیں رات کی پرچھائیں سے
ایک آئینۂ تاریک ہوئی جاتی ہے
چھپ گیا مہرِ مبیں اور شفق کی قندیل
سرد بے رحم ہواؤں سے بجھی جاتی ہے
ظلمتیں، چیر کے دامانِ فلک نکلی ہیں
نور کے ہاتھ کی تصویر مٹی جاتی ہے

اے "مرے چاند" محبت کے افق سے ہو طلوع
جگمگا آج فروغِ مہِ تاباں ہو کر
نور ہی نور سے اطرافِ جہاں کو بھر دے
پھیل جا جلوۂ بیباک و فراواں ہو کر
برق کی طرح چمک، شعلے کے مانند لپک
عمر بھر یوں تو نہ جل شمعِ شبستاں ہو کر

موج کی طرح سے وابستۂ ساحل ہی نہ رہ
حُسن کے بحر سے اٹھ عشق کا طوفاں ہو کر
قطرۂ اشک لرزتی ہوئی پلکوں پہ نہ بن
جھلملا گوہرِ خوش آب و درخشاں ہو کر
پھول کی طرح سے کھل شوق کے گلزاروں میں
پھیل جا نکہتِ گل، رنگِ بہاراں ہو کر

دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دے
تابشِ رُخ سے اندھیری میں چراغاں کر دے

حسنِ ناتمام

کس قدر شاداب و دلکش ہے وہ حسنِ ناتمام
جس کی فطرت غنچگی، دوشیزگی ہے جس کا نام

جس طرح پچھلے پہر کا صاف و پاکیزہ اُفق:
جس کے سینے سے ابھی پہلی کرن پھوٹی نہیں
جس طرح اک کھلنے والی ناشگفتہ سی کلی
جس کے دامن تک ابھی بادِ سحر پہونچی نہیں
برگِ گل پر جس طرح شبنم کی اک ننھی سی بوند
جو شعاعِ مہرِ تاباں سے ابھی الجھی نہیں
جس طرح ساغر میں صہبا جیسے مینا میں شراب
جو ابھی مچلی نہیں، چھلکی نہیں، اُبلی نہیں

جس طرح اک شوخ بجلی بادلوں کی آڑ میں
جو ابھی تڑپی نہیں، چمکی نہیں، ٹوٹی نہیں
جس طرح گیسوئے پیچاں، جیسے زلفِ خم بہ خم
جو ابھی کھُل کر ہوا کے دوش پر مہکی نہیں
جسطرح دریا میں موتی جیسے موجوں میں صدف
چشمِ انساں نے ابھی جن کی چمک دیکھی نہیں
جیسے ذہنِ پاکِ شاعر میں تخیّل کی پری
جو ابھی تک شیشۂ الفاظ میں اتری نہیں
جسطرح آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی جھلک
جو کرن بن کر لب و رخسار پر بکھری نہیں

اب تلک یوں بھی اچھوتا ہے وہ حُسنِ ناتمام
جس کی فطرت غنچگی، دوشیزگی ہے جس کا نام

لکھنؤ کی ایک شام

یہ مال روڈ یہ گرمی کی شام کیا کہنا
وفورِ جلوۂ دیدارِ عام کیا کہنا

بساطِ ارض پہ عرشِ بریں کے مہ پارے
زمیں کی گود میں ماہِ تمام کیا کہنا

دلہن کی طرح سے آراستہ دکانوں پر
جوانیوں کا حسیں اژدہام کیا کہنا

کشیدہ قامت و گل پیکر و سبک اندام
غزالِ وحشت و آہو خرام کیا کہنا

کوئی ہلال، کوئی ماہ، کوئی مہر مبیں
کوئی تمام کوئی ناتمام کیا کہنا
کسی کی شوخیٔ انداز و لغزشِ پایں
ہزار ناز و نیاز و پیام کیا کہنا
کسی کی آنکھ کے ہلکے سے اک اشارے میں
شکستِ شیشۂ و مینا و جام کیا کہنا
فضائیں رات کی پرچھائیوں کی بے تابی
زمیں پہ رقص کناں روحِ شام کیا کہنا
مچل رہی ہے جوانی ابل رہی ہے شراب
نگاہِ شوق ہے پھر تشنہ کام کیا کہنا

خیر مقدم

مبارک ہو کہ وہ غمخوارِ جانِ بیقرار آیا
سوادِ لکھنؤ میں آہوئے دشتِ تتار آیا
نگارِ نو بہار و نو بہارِ گلعذار آیا
چمن بر رنگ ساماں، رنگ سامانِ بہار آیا
عنادل سے کہو گائیں ترانے خیر مقدم کے
بہاروں کو خبر دو مطربِ سازِ بہار آیا
دلِ بیتاب کی تسکین کو پہلے خبر آئی
بڑی مدت کے بعد آخر وہ جانِ انتظار آیا
جسے سمجھا تھا دل ذ دشمنِ تمکین وہ ہوش اب تک
سکونِ روح و دل بنکر وہ یارِ غمگسار آیا

ادا کی برق چمکی زلفِ پیچاں کی گھٹا برسی
اودھر کو میکدے پر گھر کے ابرِ کوہسار آیا
ہوائے شوق سے کھلنے لگیں کلیاں تبسّم کی
نویدِ موسمِ گل مژدۂ فصلِ بہار آیا
رگوں میں خون بن کر لذّتوں کی بجلیاں دوڑیں
نگہ میں لوٹ کر شبہائے عشرت کا خمار آیا
سُنا کرتے تھے حُسنِ وینس و ہیلن کے افسانے
جمالِ وینس و ہیلن کا آخر اعتبار آیا

اکیلا ستارہ

افق کے کونے میں اک اکیلا ستارہ یوں جگمگا رہا ہے!
کہ کوئی جیسے غموں کی یورش میں زیرِ لب مسکرا رہا ہے
فضاؤں کے سرمئی دھندلکے ہیں شام تحلیل ہو رہی ہے
ہوائیں اڑتا ہے شب کا آنچل اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا ہے
ٹپک پڑا ہے سیاہ شب کی سیاہ پلکوں سے ایک آنسو
شفق کے رخسار سے ڈھلک کر زمیں کے دامن میں آ رہا ہے

سرمایہ دار لڑکیاں

شہر کے رنگیں شبستانوں کی تنویریں ہیں یہ — !
نوجوانی کے حسیں خوابوں کی تعبیریں ہیں یہ
ہے انھیں کے دم سے مصنوعی تمدّن کی بہار
ہیں یہی تہذیب کے آذرکدے کی شاہکار
دیدنی ان کی بہشتِ کیف و فردوسِ نشاط
خوش رخ و خوش پیرہن خوش پیکر و خوش اختلاط
محفلوں کی شادمانی رقص گاہوں کا سرور
دل کے کاشانوں کی آبادی طرب گاہوں کا نور
اک لطافت اک نزاکت نطق گوہر بار کی
اک شعاعِ نورِ شاعر کے تجلی زار کی

اک مغنّی کے نفس کا نغمۂ کیف و بہار
اک مصوّر کے قلم کی جنبشِ بے اختیار
بزم آرائی کی خو ذوقِ کم آمیزی کے ساتھ
جنبشِ مژگاں بھی اک شانِ دلآویزی کے ساتھ
گردنوں کا خم، کمر کا لوچ، سینوں کا ابھار
صندلی ہاتھوں سے بُت خانوں کی صبحیں آشکار
قہقہے سوئے ہوئے جذبے جگانے کیلئے
گفتگو ہر سُننے والے کو لُبھانے کے لئے
بیقرار آنکھیں دلوں کو دعوتیں دیتی ہوئی
نوجوانی بار بار انگڑائیاں لیتی ہوئی
ولولے ہر ہر نفس زیر و زبر ہوتے ہوئے
دم بدم جھونکے ہوا کے تیز تر ہوتے ہوئے

سامنے اک بار آجانا ٹھٹکنے کے لئے
نوجوانوں سے اُلجھ پڑنا جھجکنے کے لئے
اہرمن تو اہرمن ہوجائے یزداں بھی شکار
ان کا ہر انداز تاجر ہر ادا سرمایہ دار
عشق کے ذوقِ نظارہ نے نکھارا ہے انھیں
مرد کی صدیوں کی محنت نے سنوارا ہے انھیں

ڈوب تو سکتی ہیں یہ لیکن اُبھر سکتی نہیں
یہ کنار و بوس کی حد سے گذر سکتی نہیں

مزدور لڑکیاں

گردشِ افلاک نے گودی میں پالا ہے انھیں:
سختیِ آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
گھورتی رہتی ہے گرمی میں نگاہِ آفتاب
آسماں کرتا ہے نازل اِن پہ کرنوں کا عتاب
سر سے ساون کی گھٹا جاتی ہے منڈلاتی ہوئی
سرد جاڑوں کی ہوا سینوں کو برماتی ہوئی
بیکسی اِن کی جوانی، مفلسی اِن کا شباب
ساز اِن کا سوزِ حسرت، خامشی اِنکا رباب
سر سے پا تک داستانیں حسرتِ ناکام کی
نرم و نازک قہقہوں میں تلخیاں ایّام کی

خشک لب، بھیگی نظر، مدقوق چہرے، زرد گال
وہ دھنسی آنکھیں، فسردہ رنگ، گرد آلود بال
پپڑیاں ہونٹوں پہ زخموں کے کناروں کی طرح
گرم ماتھوں پر عرق مدھم ستاروں کی طرح
بوجھ کا مرہونِ منت اُن کے ابرو کا تناؤ
اُن کا حاکم ظلم اُن کا پاسباں بے جا دباؤ
ان کے ساتھی پھاوڑے، انکی سہیلی ہے کدال
زندگی پر یہ وبال اور زندگی اُن پر وبال
لیکن اُن کی پستیوں کو اپنی رفعت سے نہ دیکھ
ان کی غربت پر نہ جا ان کو حقارت سے نہ دیکھ

فٹ پاتھیوں کے حق میں کہوں کیا رہی ہے دھوپ
یہ کھا رہے ہیں اس کو انھیں کھا رہی ہے دھوپ

اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب
ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشمِ انقلاب
ٹھوکروں پر ان کی جھک سکتے ہیں ایوان قصور
توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کے غرور
ان کی چوٹوں پر نکلتے ہیں پہاڑوں سے شرار
یہ اگر چاہیں الٹ ڈالیں بساطِ روزگار

بن کے قوت ایک دن ابھرے گی صدیوں کی تھکن!
دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظامِ انجمن

انتظار نہ کر

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

عجب گھڑی ہے میں اسوقت آ نہیں سکتا!
سُرورِ عشق کی دُنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے سازِ محبت پہ گا نہیں سکتا

میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

خراج اپنی جوانی سے لے رہا ہوں میں
سفینہ خون کے دریا میں کھے رہا ہوں میں
صدا اجل کے فرشتے کو دے رہا ہوں میں

بس اب نوازشِ پیہم سے شرمسار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

عذارِ نرم پہ رنگِ بہار رہنے دے
نگاہِ شوق میں برق و شرار رہنے دے
لبوں پہ خندۂ بے اختیار رہنے دے
متاعِ حسن و جوانی کو سوگوار نہ کر!
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

شکستہ ساز کی ٹوٹے ہوئے سبو کی قسم
دھڑکتے دل کی ٹپکتے ہوئے لہو کی قسم
تجھے وطن کے شہیدوں کی آبرو کی قسم
اب اپنے دیدۂ نرگس کو اشکبار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

سنہ ۱۹۳۹ء

عہدِ حاضر

وقت کی پلکوں پہ اک آنسو چمکتا ہے مگر
تھرتھرا سکتا ہے عارض پر ٹپک سکتا نہیں

عمر کی بوڑھی رگوں میں نوجوانی کا لہو
دوڑتا پھرتا ہے چہرے پر جھلک سکتا نہیں

تاجِ انگریزی میں اک ہیرا ہے مثلِ آفتاب
ہند کے بے نور ماتھے پر چمک سکتا نہیں

چپکے چپکے کھل رہا ہے عہدِ نو کا سرخ پھول
مسکرا سکتا ہے زیرِ لب مہک سکتا نہیں

ایک انگارہ چھپا ہے زندگی کی راکھ میں
راکھ کے نیچے سلگتا ہے دہک سکتا نہیں

سنہ ۱۹۴۰ء

ایک سوال

معلوم نہیں ذہن کی پرواز کی زد میں
سرسبز امیدوں کا چمن ہے کہ نہیں ہے
لیکن یہ بتا وقت کا بہتا ہوا دھارا
طوفان گر و کوہ شکن ہے کہ نہیں ہے
سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسّم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے
وہ زیرِ افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانیٔ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اُٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

نیا زمانہ

اے دوست نیا زمانہ آیا
بہنے لگا زندگی کا دھارا
مشاطۂ عہد نو نے بڑھ کر
فطرت کی عروس کو سنوارا
غنچوں نے نیا لباس پہنا
کلیوں نے بھی پیرہن اتارا
لالے کے جگر کی آگ بھڑکی
نرگس نے نگہ کا تیر مارا
رنگین شفق نے گو دکھولی
سورج نے افق سے سر ابھارا
انوارِ سحر میں ہو گیا گم
ڈھلتی ہوئی رات کا ستارا

گہری بہت شکن ہے جبینِ حیات کی
یہ خط نہیں مصوّرِ رنگیں کمال کا
ابروئے کائنات پہ ہے بجلیوں کی ضو
پرتو نہیں ہے عارضِ آتش جمال کا
یہ وقت کے کھنچے ہوئے خنجر کی دھار ہے
یہ بانکپن نہیں ہے عروسِ ہلال کا
فولاد کی گرج ہے یہ آہن کا شور ہے
نغمہ نہیں ہے شاعرِ نازک خیال کا

اختلافِ رائے

کیوں نہیں تجھ کو گوارا مرا اظہارِ خیال
یہ کوئی زہر بھرا جام نہیں ہے اے دوست

اختلافات سے کھلتی ہے تخیل کی گرہ
یہ بھی اک رائے ہے دشنام نہیں ہے اے دوست

کشمکش عظمتِ کردار عطا کرتی ہے
زندگی عافیت انجام نہیں ہے اے دوست

ٹوٹا ہوا ستارہ

آ رہا ہے اک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار
اپنے دل کے شعلۂ سوزاں میں خود جلتا ہوا
منتشر کرتا ہوا دامانِ ظلمت میں شرار
اپنی تنہائی پہ خود ہی ناز فرماتا ہوا
شوق پر کرتا ہوا آئینِ فطرت کو نثار
کس قدر بے باک، کتنا تیز، کتنا گرم رو
جس سے سیاروں کی آسودہ خرامی شرمسار

موجۂ دریا اشاروں سے بلاتی ہے قریب
اپنی سنگیں گود پھیلائے ہوئے ہے کوہسار
ہے ہوا بے چین آنچل میں چھپانے کیلئے
بڑھ رہا ہے کرّۂ گیتی کا شوقِ انتظار

لیکن ایسے انجم روشن جبیں و تابناک
آپ ہو جاتے ہیں اپنی تابناکی کا شکار

وہم و خیال

زمانہ ماقبل تاریخ کے انسان کا ذہنی تجزیہ

وقت

مسکراتے ہیں مناظر رقص کرتے ہیں نجوم
گنگناتی ہیں چٹانیں گا رہے ہیں آبشار
چھن رہا ہے ابر کے پردے سے نورِ آفتاب
اور فضا میں پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی سی پھوار
وقت کے میلے بدن پر دھاریاں ہیں نور کی
تھرتھراتے ہیں ہوا میں سیکڑوں چاندی کے تار
عارضِ گلرنگ پر صبحِ تمدن کی نمود
گود میں تہذیبِ انسانی کا طفلِ شیرخوار

آنکھ میں ماضی کا جادو، رخ پہ مستقبل کا نور
انکھڑیوں میں ارتقا کے جامِ رنگیں کا خمار
اپنے سینے میں لئے انسان کے سینے کا جوش
دوش پر اپنے اٹھائے فکرِ انسانی کا بار

فکرِ انسانی

ٹوٹتی ہے کیوں شعاعِ مہرِ تاباں کی کمند
شب اٹھا لیتی ہے کیوں ناہید و پروین کا ستار
رات کے ڈھلتے ہی پڑ جاتی ہے پھیکی چاندنی
صُبح ہوتے کیوں بکھر جاتا ہے تاروں کا غبار
جھُوم کر اُٹھتی ہے کیوں اُودی فضاؤں میں گھٹا
کوہ و صحرا پہ برس جاتا ہے کیوں ابرِ بہار
کیوں پلٹ جاتا ہے موسم کیوں بدل جاتی ہے رُت
کھیلتی ہے کیوں خزاں کی گود میں فصلِ بہار
موت اُڑا لیتی ہے کیوں گُل فام رخساروں سے رنگ
ہے اجل کی نیند کا کیوں چشمِ مستی میں خمار

رات کو ہوتا ہے کیوں گذرے مناظر کا ہجوم
خواب میں رہتی ہے کیوں پیشِ نظر تصویرِ یار
ذہن کی تاریکیوں میں نور پھیلاتا ہے کون
کس کے نغمے ہیں سرودِ زندگی پر بیقرار
زیرِ دامانِ اُفق سے پھول برساتا ہے کون
کون ہوتا ہے شفق کے رنگ میں آئینہ کار
کون سوتا ہے ردائے برف میں لپٹا ہوا
کوہ کی چوٹی ہے کس دوشیزہ سینے کا اُبھار
آندھیوں سے اسطرح سرگوشیاں کرتا ہے کون
گونجتی ہے وادیٔ کہسار میں کس کی پکار
کس کی ہیبت ہے کہ گینتی کا دہل جاتا ہے دل
"کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار"
آسماں پر ہے یہ کس کے تازیانوں کی صدا
آرہا ہے کون یہ بادل کے گھوڑے پر سوار
اُٹھ رہا ہے کیوں پہاڑی کے کلیجے سے دُھواں
ناچتا ہے کون یہ پہنے ہوئے شعلوں کے ہار

الاماں اے عالمِ فطرت کی ارواحِ عظیم
ہے حدِ ادراک سے باہر تمہارا اقتدار
ہے عناصر میں تمہارے حسن و ہیبت کی نمود
آتش و آب و ہوا پر ہے تمہارا اختیار
تم وہاں رہتی ہو انسانی تخیّل سے پرے
جس جگہ جھک کر زمیں کو آسماں کرتا ہے پیار
نذر لائے ہیں تمہاری بارگاہِ ناز میں
خوف کے مارے ہوئے مجبور انسانوں کی ہار
دیکھ کر انساں کی پستی وقت بھی شرما گیا
ارتقا کے نرم ماتھے پر پسینہ آگیا

ارتقا

آہ اے ناداں خیالی دیوتاؤں کو نہ پوج
ذہن میں بنتے ہیں جو ایسے خداؤں کو نہ پوج
جو برستے ہیں یہاں بھی اور وہاں بھی ہم نشیں
ایسے آوارہ طبیعت بے وفاؤں کو نہ پوج

ہاں مرادیں اپنی ان گونگی چٹانوں سے نہ مانگ
قدر کر اپنے ارادوں کی دعاؤں کو نہ پوج
پوجنا ہے پوج اپنی فطرتِ آزاد کو
مشرق و مغرب کی آوارہ ہواؤں کو نہ پوج
گود میں سمٹی ہوئی رعنائیوں کو چھوڑ کر
وادی و کہسار کے رنگیں اداؤں کو نہ پوج
بھول کر اپنے سرود لذتِ گفتار کو
آسماں میں گونجنے والی صداؤں کو نہ پوج

یہ خدا یہ دیوتا دو روز ہی رہ پائیں گے
جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مرجائیں گے

غالب

آسمانوں کی بلندی کو بلا کا ناز تھا
پست ہمت جس سے ذوقِ رفعتِ پرواز تھا
رہگذارِ ماہ و انجم تک کوئی جاتا نہ تھا
کوئی شاخِ کہکشاں پہ بیٹھ کر گاتا نہ تھا
عرش پر جبریل کا دمساز ہو سکتا تھا کون
طائرِ سدرہ کا ہم آواز ہو سکتا تھا کون
جو لگا دے آگ کوئی نغمہ زن ایسا نہ تھا
تجھ سے پہلے کوئی داؤدِ سخن ایسا نہ تھا
تو نے چھیڑے ہیں وہ نغمے شاعری کے ساز پر
لحنِ داؤدی کو رشک آئے تری آواز پر

ترا بربط کہکشاں، ناہید ہے تیرا رباب
آسماں کیا ہے ترے بحر تخیل کا حباب

تیرا نغمہ ساحری، تیرا بیاں پیغمبری
تیرے قبضے میں ہے اقلیم سخن کی داوری

تیری فکر نکتہ رس حسن تخیل کا شباب
شعر تیرا معجزہ تیری کتاب ام الکتاب

وہ صداقت وہ حقیقت وہ جمال برق پاش
زندگی جس کے لئے قرنوں سے سرگرم تلاش

وہ صداقت عکس افگن ہے تری تقریر میں
وہ حقیقت جلوہ فرما ہے تری تحریر میں

حسن کے جلووں سے جب محروم ہو جاتے ہیں ہم
کذب کے ظلمت کدے میں جاکے کھو جاتے ہیں ہم

جب کہ ہوتا ہے شب غم میں بلاؤں کا نزول
جب نگاہیں پھیر لیتے ہیں مہ و مہر و نجوم

شعر تیرے جگمگا اٹھے ہیں اس ظلمات میں
جس طرح جگنو چمکتے ہیں بھری برسات میں
تو نے دل کو گرم سینوں کو فروزاں کر دیا
رُوح کو روشن دماغوں کو چراغاں کر دیا
تو مثالِ شمع ماضی کے سیہ خانے میں ہے
نور تیرا حال و مستقبل کے کاشانے میں ہے
تیرے گلشن کی بدولت گُل بداماں ہم بھی ہیں
تیرے نغموں کے اثر سے نغمہ ساماں ہم بھی ہیں

١٦١٠٨

موت اور زندگی

وہ جبیں جس پہ چمکتا تھا دمکتا ہوا چاند
سرد ہے اوس میں بھیگے ہوئے پھولوں کی طرح
جسم لکڑی کی طرح سخت ہوا جاتا ہے
ہاتھ ہیں خشک بیاباں کے ببولوں کی طرح

آنکھ ہے بند لب نغمہ فشاں ہے خاموش
موت کی برف جمی جاتی ہے رخساروں پہ
مردنی چہرے پہ یوں چھائی ہوئی ہے جیسے
راکھ کا ڈھیر ہے بجھتے ہوئے انگاروں پر

اب نہ دوڑے گا لہو اب نہ چلیں گی نبضیں
اب نہ مہکیں گے ترے عارضِ رنگیں کے گلاب
اب تنیں گی نہ بھویں اب نہ جھکیں گی پلکیں
اب نہ ٹپکے گی نگاہوں سے محبت کی شراب

اب نہ پھیلے گی تری زلفِ پریشاں کی شمیم
عکس تیرا نہ نظر آئے گا آئینے میں
اب نہ چونکائیں گی قدموں کی صدائیں تجھ کو
کوئی طوفان اٹھے گا نہ تیرے سینے میں

چوڑیاں تیری کلائی کے لئے روئیں گی
کنگھیاں ترسیں گی اُلجھے ہوئے بالوں کے لئے
ہو گی سُرمے کو ترے دیدۂ و مژگاں کی تلاش
غازہ رکھا ہی رہے گا ترے گالوں کے لئے

کوئلیں کوکیں گی، گائیں گے پپیہے لیکن
آہ تو پیار بھرے گیت سنے گی نہ کبھی

گھر کے آکاش پہ ساون کی گھٹا آئے گی!
تو مگر اپنے دوپٹے کو چُنے گی نہ کبھی

رات ڈھونڈے گی تجھے لیکے ستاروں کے چراغ
صبحیں بھٹکیں گی بیاباں ہیں کہستانوں میں
جاکے ہر سمت پکاریں گی ہوائیں تجھکو
پھول دیکھیں گے تری راہ گلستانوں میں

ڈھونڈنے والے تجھے ڈھونڈ کے تھک جائیں گے
بزمِ فطرت کی کسی شئے میں نہ پائیں گے سراغ
صبر کرلیں گے تری موت پہ رونے والے
جھلملا جاتے ہیں انسان کی یادوں کے چراغ

کیا بس اتنا ہی ہے اس پیکرِ خاکی کا مآل؟
سیلِ بیباکِ حوادث میں بشر کچھ بھی نہیں؟

یک نفس بیش نہیں فرصت ہستی یہ کیا؟
گرمئ بزم بجز رقص شرر کچھ بھی نہیں؟

(ماخوذ از غالب)

اپنی گڑیا سے مگر کھیل رہا ہے یہ کون؟
مجھ کو جیسے تری تصویر نظر آتی ہے
اس کی ننھی سی دمکتی ہوئی پیشانی پر
ایک کھوئی ہوئی تنویر نظر آتی ہے

اس کے چہرے پہ ترے حسن کی تابانی ہے
اس کی آنکھوں میں جھلکتی ہے جوانی تیری
نرم سینے میں تری موجِ نفس ہے بیتاب
لبِ معصوم پہ ہے نغمہ فشانی تیری

موت جب آکے کوئی شمع بجھا دیتی ہے
زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

نئی شاعری

آگ محفل میں غلاموں کی لگا دیں اے دوست
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دیں
گائیں ٹوٹے ہوئے بربط پہ ترانے دل کے
بزم کو اپنی نواؤں سے غزل خواں کر دیں
کعبہ و دیر و کلیسا کی بجھا دیں قندیل
ہر طرف مشرق و مغرب میں چراغاں کر دیں
توڑ دیں وہم نے پہنائی تھیں جو زنجیریں
آگیا وقت کہ اب وا درِ زنداں کر دیں
ڈال دیں وقت کی افسردہ نگاہوں میں نگاہ
عہدِ پارینہ کو اک خوابِ پریشاں کر دیں

رنگِ خوں بھر کے بنائیں وہ نئی تصویریں!
کاوشِ مانی و بہزاد کو حیراں کر دیں

چھین لیں ہاتھ بڑھا کر مہ و پرویں سے چمک
ہند کی خاک کے ذرّوں کو درخشاں کر دیں

مسندِ عیش سے شاہوں کو اٹھا دیں چل کر
"مور بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کر دیں"

کب تلک راہ کے کانٹوں سے بچائیں گے قدم
ان کو تھوڑا سا لہو دے کے گلستاں کر دیں

اب نظر پھیر لیں ایران کے گلزاروں سے
نگہِ شوق کو کشمیر بداماں کر دیں

دے کے احساس نیا ہند کے مہ پاروں کو
حسنِ یوسف کو چراغِ تہہ داماں کر دیں

عام ہو غالبؔ و اقبالؔ کی رعنائیٔ فکر
بے زبانوں کو زباں دے کے زباں داں کر دیں

کھول دیں سب کے لئے قفلِ درِ میخانہ
حضرتِ جوشؔ کو سر حلقۂ رنداں کر دیں

بغاوت

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر بغاوت ہے خدا میرا

بغاوت رسمِ چنگیزی سے تہذیبِ تتاری سے
بغاوت جبر و استبداد سے سرمایہ داری سے
بغاوت سرسوتی سے لکشمی سے بھیم وارجن سے
بغاوت دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدن سے
بغاوت وہم کی پابندیوں سے قید و ملّت سے
بغاوت آدمی کو پیسنے والی مشیّت سے
بغاوت عزت و پندار و نخوت کی اداؤں سے

بغاوت بوالہوس ابلیس سیرت پارساؤں سے
بغاوت زرگری کے مسخ مذہب کے ترانوں سے
بغاوت عہدِ پارینہ کی مردہ داستانوں سے
بغاوت اپنی آزادی کی قیمت کھونے والوں سے
بغاوت عظمتِ رفتہ کے اوپر رونے والوں سے
بغاوت دورِ حاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے
بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بد دعاؤں سے
بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے
بغاوت ایک انساں کے سوا سارے زمانے سے

بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے
بغاوت عصرِ حاضر کے سپوتوں کا ترانہ ہے

سنہ ۱۹۳۷ء

جوانی

نہ چھیڑ اے ہم نفس ٹوٹے ہوئے بربط کے تاروں کو
جگایا یوں نہیں کرتے ہیں خوابیدہ شراروں کو

مری آشفتہ حالی دیکھ کر تو مسکراتا ہے
مرے بوسیدہ پیراہن سے تو نظریں چراتا ہے

مری آواز تیرے نرم کانوں پر گراں کیوں ہے
مری افسردگی سے اسقدر تو بدگماں کیوں ہے

زمانے کا ستم ہر دم رہا ہے رازداں میرا
بھرا ہے ایسے ہی کانٹوں سے سارا گلستاں میرا

غموں کو روندکر ہنستا ہوا پھرتا ہوں دنیا میں
طمانچے موج کے کھاتا ہوا جاتا ہوں دریا میں

زمانے بھر میں تنہا راز داں ہوں لذّتِ غم کا
سراپا درد ہو کر بھی ہوں درماں سارے عالم کا
مری فطرت زمیں کی وسعتوں کو تنگ کہتی ہے
مری عزت اضافی عزّتوں کو ننگ کہتی ہے
امنگوں نے مجھے دودھ اپنے سینے سے پلایا ہے
ہزاروں ولولوں نے میرا گہوارہ ہلایا ہے
کھلایا ہے مجھے گودوں میں جراءت نے حمیت نے
سلایا لوریاں دے کر مجھے ہمت نے عزت نے
جہاں کی گردشوں نے درد و غم کی راحتیں بخشیں!
مری خودداریوں نے زندگی کی لذتیں بخشیں
مرے نعروں میں ہے جاہ و جلالِ جوشِ طوفانی
مری آہوں میں بل کھاتی ہوئی موجوں کی طغیانی
مری آواز میں لاکھوں یتیموں کی دعائیں ہیں
مرے نغموں میں زنجیروں کے بجنے کی صدائیں ہیں

مرے زخموں میں حدت زندگی کے آفتابوں کی
مری ٹھوکر میں پنہاں داستانیں انقلابوں کی
نیا نغمہ کوئی جب سانس لے لیتا ہے سینے میں
ہزاروں داغ پڑ جاتے ہیں پتھر کے کلیجے میں
چٹانوں کا جگر پھٹتا ہے اس نغمہ سرائی سے
پگھل جاتا ہے دل آہن کا اس آتش نوائی سے
گرج گولوں کی اکثر بے اثر ہوتی ہے کانوں پر
کبھی جب نیند آجاتی ہے توپوں کے دہانوں پر
گذر جاتا ہوں طوفاں بن کے دریا کے کناروں سے
پہاڑوں کو ہٹا دیتا ہوں آنکھوں کے اشاروں سے
زمانے بھر پہ چھا جاتا ہوں شفقتِ آسماں ہو کر
اچھل جاتا ہوں جب ساحل سے موجِ بیکراں ہو کر
میں چشمہ بن کے پتھر کے شگافوں سے ابلتا ہوں
تڑپ موجوں کی بن کر سنگ ریزوں پر مچلتا ہوں
سکوں کو لا کے ہنگاموں کے پہلو میں سلاتا ہوں

نوائے تلخ سے میں سارے عالم کو جگاتا ہوں
پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سُلطاں کو
بٹھا دیتا ہوں لا کر تخت پر قیصر کے دہقاں کو
مرا جی لگ نہیں سکتا ہے شاہوں کے شبستاں میں
بنایا ہے نشیمن میں نے زخموں کے گلستاں میں
مرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے

حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مسلک میرا مذہب نوجوانی ہے

سنہ ۱۹۳۷ء

سماج

چھپی بیٹھی ہے مکاری حریمِ زہد و تقوی میں
گناہوں کی جھلک ہے حسنِ معصومِ کلیسا میں
عیاں سفاکیاں پرہیزگاروں کی جبینوں سے
ٹپکتا ہے لہو پیرِ حرم کی آستینوں سے
ریاکاری اشارے کر رہی ہے چشمِ پرفن سے
تعصّب کی صدا آتی ہے ناقوسِ برہمن سے
اخوّت کی زباں محرومِ اندازِ تکلّم ہے
بتانِ رنگ و خوں کے لب پہ زہریلا تبسّم ہے
نہ جانے کیوں یہ دُنیا قومیت کے راگ گاتی ہے
یہ وہ چکّی ہے جس میں آدمیت پیسی جاتی ہے
نظامِ کہنہ کے کندھوں پہ اصلاحوں کے لاشے ہیں
بہت سے بت ملوکیت کے آذر نے تراشے ہیں

دھمک پیروں کے نیچے ہے گرج توپوں کی کانوں پر
گھٹائیں جنگ کی منڈلا رہی ہیں آسمانوں پر
فضا بگڑی ہوئی ہے زہر پھیلا ہے ہواؤں میں
نئی پرخاش ہے جھوٹی سیاست کے خداؤں میں
بیابانوں پہ حملہ ہے پہاڑوں پر چڑھائی ہے
سمندر پر چھڑی ہے جنگ شہروں پر لڑائی ہے
قیامت کب تلک ڈھائیں گے یہ آفت کے پرکالے
یہ جمہوری کمیں گاہوں میں چھپ کر بیٹھنے والے
تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی

نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بیتاب ہے کروٹ بدلنے کو

سنہ ۱۹۳۹ء

سالِ نو

یہ ٹیلی فون پر دی سالِ نو کی تہنیت کس نے
تمنّا رقص کرتی ہے تخیّل گنگناتا ہے
تصوّر اک نئے احساس کی جنت میں لے آیا
نگاہوں میں کوئی رنگین چہرا مسکراتا ہے
جبیں کا عکس پڑتا ہے فلک کے ماہ پاروں پر
ضیا پھیلی ہوئی ہے سارا عالم جگمگاتا ہے
شفق کے نور سے روشن ہیں محرابیں فضاؤں کی
ثریّا کی جبیں زہرہ کا عارض تمتماتا ہے
پرانے سال کی ٹھٹھری ہوئی پرچھائیاں سمٹیں
نئے دن کا نیا سورج افق پر اٹھتا آتا ہے

زمیں نے پھر نئے سر سے نیا رخت سفر باندھا
خوشی سے ہر قدم پر آفتاب آنکھیں بچھاتا ہے
ہزاروں خواہشیں انگڑائیاں لیتی ہیں سینے میں
جہانِ آرزو کا ذرّہ ذرّہ گیت گاتا ہے
امیدیں ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں مسکراتی ہیں
زمانہ جنبشِ مژگاں سے افسانہ سناتا ہے
مسرت کے جواں ملاح کشتی لے کے نکلے ہیں
غموں کے ناخداؤں کا سفینہ ڈگمگاتا ہے
خوشی مجھ کو بھی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں
مسرت کے اس آئینے میں غم بھی جھلملاتا ہے
ہمارے دورِ محکومی کی مدت بڑھتی جاتی ہے
غلامی کے زمانے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے
یہی انداز گر باقی ہیں اپنی سست گامی کے
نہ جانے اور کتنے سال آئیں گے غلامی کے

آتشیں ستارہ

(ہندستانی طلبا کے نام جن کے سرخ رنگ کے جھنڈے پر ایک چمکتے ہوئے
ستارے کے نیچے لکھا ہے ــــ "آزادی ــــ امن ــــ اتحاد ــــ")

دوشیزہ ایک آئی نظر رہگذار میں
گویا اٹی ہوئی تھی شفق کے غبار میں
نورِ سحر سے لوحِ جبیں تھی دُھلی ہوئی
پیکر کی آب و تاب میں شبنم گھلی ہوئی
پارہ بدن میں برق کی لہریں نگاہ میں
اک "آتشیں ستارہ" تھا زلفِ سیاہ میں
پوچھا یہ میں نے "آئی ہے تو کس جہان سے ؟
کس طرح پھول توڑ لیا آسمان سے ؟
یوں مسکرائی وہ کہ کرن سی بکھر گئی
اک موجِ نور تھی کہ اُفق سے گذر گئی

کہے گی یہ دھرتی ہندوستان ہوں میں
خود کارواں نہیں، جرسِ کارواں ہوں میں
بالوں میں آسماں کا ستارہ نہیں ہے یہ
سورج کے جلتے دل کا شرارہ نہیں ہے یہ
اس کی جبیں پہ نقش ہیں عزمِ ثبات کے
ابھرا ہے یہ حسین اُفق سے حیات کے
اس کی چمک نہیں ہے خوشی کا شگون ہے
اس کی رگوں میں صرف جوانی کا خون ہے
سینے میں سُرخ آگ دبی ہے شباب کی
شعلے ہیں روح کے ہے تڑپ انقلاب کی
یہ اتحادِ قوم و وطن کا رسول ہے
آزادی، امن اور ترقی کا پھول ہے"

جنگ اور انقلاب

رقص کر لے روحِ آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات
زندگی مینا و ساغر سے ابل جانے کو ہے
کامرانی کے نئے سانچے میں ڈھل جانے کو ہے
اُڑ رہا ہے ظلم و استبداد کے چہرے سے رنگ
چھٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ
ہے فضاؤں میں نویدِ شادمانی کا سرور
پڑ رہا ہے عشرتِ فردا کی پیشانی پہ نور
موت منہ کر دیکھتی ہے آئینہ تلوار میں
زر پرستی کا سفینہ آگیا منجدھار میں

خون کی بو سے مشامِ زندگی مخمور ہے
گولیوں کی سنسناہٹ سے فضا معمور ہے
یہ ہے وہ زنجیر خود ہاتھوں سے ڈھالا تھا جسے
یہ ہے وہ بجلی کہ خود خرمن نے پالا تھا جسے
تیر جو چٹکی میں تھا پیوست اب بازو میں ہے
آستیں میں تھا جو خنجر آج وہ پہلو میں ہے
آ گیا ہے وقت وہ جو آ کے ٹلتا ہی نہیں
اپنا لنگر آج اپنے سے سنبھلتا ہی نہیں
ہل چکا ہے تختِ شاہی گر چلا ہے سر سے تاج
ہر قدم پر ڈگمگایا جا رہا ہے سامراج
ڈھل رہی ہے زرگری کی رات کٹتے تاروں کی چھاؤں
مفلسی پھیلا رہی ہے وقت کی چادر میں پاؤں

انقلابِ دہر کا چڑھتا ہوا پارہ ہے جنگ
وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا ہے جنگ
ہم سے خودداروں کا اس دم گیت گانا خوب ہے
سر پھرے باغی جوانوں کا ترانہ خوب ہے
غم کے سینے میں خوشی کی آگ بھرنے دو ہمیں
خوں بھرے پرچم کے نیچے رقص کرنے دو ہمیں
رقص کے پہیے کی گردش رک نہیں سکتی کبھی
عمر کی نبضوں کی جنبش رک نہیں سکتی کبھی
روحِ آزادی کو سینے میں جکڑ سکتا ہے کون
ناچتے سورج کی کرنوں کو پکڑ سکتا ہے کون

ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء

سامراجی لڑائی

مے خانے کی رسم و راہ بدلی — ساقی کی حسیں نگاہ بدلی
بدلے ارض و سما کے تیور — ہیں شعلہ فشاں فضا کے خنجر
طیّارے ہیں پر فشاں ہوا میں — بمبار گرجتے ہیں فضا میں
توپوں سے دہل رہی ہے دنیا — اک آگ میں جل رہی ہے دنیا
شائستگی حسن کھو رہی ہے — تہذیب کی آنکھ رو رہی ہے
بندوقوں کے شور سے ہیں پھیکے — طاؤس و رباب کے بھی نغمے
بارود کی بو میں غرق یکسر — پھولوں کی شمیم روح پرور
فرصت نہیں جام اور سبو کی — قیمت نہیں موجِ رنگ و بو کی

ویراں ہیں ساری رقص گاہیں   چوروں سے بھری ہوئی ہیں راہیں
بے رنگ حیاتِ زندگانی   بے کیفِ شباب ہے جوانی
میدان ہے جنگ ہے جدل ہے   سرمائے کے پیڑ کا یہ پھل ہے
شرمندہ ہیں دیکھ کر یہ لشکر!   چنگیز و ہلاکو و سکندر
دنیا ہے کہ تاجروں کی بستی   مہنگی ہے حیات موت سستی
جان بیچ کے لڑتے ہیں سپاہی   انسان پہ آگئی تباہی

یہ ظلم و ستم کا راج کب تک
یہ تختِ شہی یہ تاج کب تک

سنہ ۱۹۴۰ء

ایک خط

جیل سے ایک دوست کے پہلے خط کا جواب

یہ ترا چھوٹا سا خط تیری محبت کا پیام
کر رہا ہے دل سے سرگوشی نگاہوں سے کلام
اس کی خاموشی میں ہے تیرے تکلم کی نمود
توڑ ڈالا اس نے آکر قید خانے کا سکوت

آرزوئیں ناچ اٹھی ہیں دلِ بے تاب میں
کتنی قندیلیں ہیں روشن وقت کی محراب میں
جھلملاتے ہیں پرانی زندگی کے ماہ و سال
مسکراتی ہے تمنا رقص کرتا ہے خیال

آج روحِ شادمانی کس قدر مخمور ہے
آج دل احساسِ ناکامی سے کوسوں دور ہے

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

موت

جیل میں ایک دوست کے مرنے کی خبر سن کر

اک شرر کی طرح گذرا عمر کی منزل سے تو
ہم نشیں کیا بات تھی کیوں اُٹھ گیا محفل سے تو
ہم سنوں کی انجمن کس واسطے بھائی نہیں
راس کیوں آب وہوائے زندگی آئی نہیں
دل کی جمعیت ترے جانے سے برہم ہوگئی
دم کے دم میں بزمِ عشرت بزمِ ماتم ہوگئی
تو نے سازِ دل پہ نغمے شوق کے گائے نہ تھے
مر گیا تو اور ابھی مرنے کے دن آئے نہ تھے
بجلیوں کی طرح لہرا کر فضا میں کھو گیا
ایک ہلکی سی جھلک دکھلا کے غائب ہو گیا

جس قدر سیماب پا تھا اس قدر پیارا تھا تو
قطرۂ شبنم تھا تو یا صبح کا تارا تھا تو
مسکرایا تھا مگر آنسو بہانے کے لئے
تو وہ تارا تھا جو چمکا ٹوٹ جانے کے لئے

اے انیسِ برق فطرت اے رفیقِ تیز گام
مڑ کے لیتا جا اسیرانِ محبت کا سلام
میرے طاقِ دل میں اک رنگین گلدستہ ہے تو
بچپنے کی سیکڑوں یادوں سے وابستہ ہے تو
زندگی کے مکتبِ دل میں سبق لیتے تھے ہم
تا و طفلی کی جوانی کی طرف کھچتے تھے ہم
چاہے جب مکتب سے اٹھ کر بھاگ آنا یاد ہے
پھر خوشی سے ہنستے ہنستے لوٹ جانا یاد ہے
آپ لڑتے آپ ہی جھگڑا چکا لیتے تھے ہم
اس طرح اپنی محبت آزما لیتے تھے ہم
تھی کسی کو بھی نہ ہم دونوں میں فکرِ روزگار
آہ ہم دونوں ہی تھے دلدادۂ سیر و شکار

تیز دوڑاتے ہوئے گھوڑوں کو اتراتے تھے کیا
باغ و صحرا کی ہوا کھا کھا کے لہراتے تھے کیا
زندگی بے فکریوں کی راگنی گاتی رہی
باغِ طفلی میں جوانی کی ہوا آتی رہی
ہائے وہ خلد علیگڈھ کی پرانی صحبتیں
کھو گئیں ماضی کے ویرانے میں کتنی جنتیں

قید کی تنہائیوں میں یاد آتی ہے تری
بجلیاں سی کوند جاتی ہیں نگاہوں میں مری
دل دعائیں دے رہا ہے جیل کی دیوار کو
رہ گئیں آنکھیں ترس کر آخری دیدار کو

یوں تو ہے بزمِ جہاں میں موت قانونِ حیات
ہے تغیر ہی سے روحِ زندگانی کو ثبات
موت ہی سے زندگی کا رقص و دنیا کا وجود
موت کیا ہے ایک تغیرِ عناصر کی نمود

یہ وہ کہنہ مے ہے جو ہستی کے پیمانے میں ہے
موت عکس افگن جہاں کے آئینہ خانے میں ہے
موت کا غم کرکے کوئی شخص جی سکتا نہیں
موت سے گھبرا کے کوئی زہر پی سکتا نہیں
دل مگر ٹکڑے ترے ناوقت مر جانے سے ہے
غم یہ نو آراستہ زلفیں بکھر جانے سے ہے

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

رہائی

اس نظارے کے تصور ہی سے ہے دل پاش پاش
اک پھٹے کمبل کے ٹکڑے پر ہے اک قیدی کی لاش
کھنچ کے آیا دل سے پتھرائی ہوئی آنکھوں میں درد
اینٹھتے ہونٹوں پہ جم کر رہ گئی اک آہِ سرد
نزع کے عالم میں یوں رگڑیں زمیں پر ایڑیاں
گر گئیں کٹ کر غلامی کی پرانی بیڑیاں
چھٹ گئی قیدِ حوادث سے وہ جانِ بیقرار
موت نے سینے پہ اپنے لے لیا دھرتی کا بار

تھا غلام آباد میں تجھ کو نہ جینے کا دماغ
نصف شب آئی نہ تھی اور بجھ گیا تیرا چراغ

زندگی کی مٹ گئی دھندلی سی اک تصویر آج
ڈھونڈھتی ہے تجھ کو اک ٹوٹی ہوئی زنجیر آج
گھر پہ تڑپاتا ہے سب کو تیرا دردِ انتظار
رو رہی ہے جیل اس پر چھن گیا منہ سے شکار
کوئی تجھ سے جبر سے اب کام لے سکتا نہیں
کوئی روکھے پن سے اب آواز دے سکتا نہیں

زندگانی تھی تری بے منتِ مینا و جام
عمر کی راہوں میں بے آوازِ پا تیرا خرام
تیری جانب اُٹھ نہ سکتی تھی زمانے کی نظر
تو تھا اک آنسو کا قطرہ وقت کے رخسار پر
گو ترا دل شوق کی لذت سے بیگانہ نہ تھا
تو جہاں میں شہرت و عزت کا دیوانہ نہ تھا
کام تھا تجھ کو اگر کوئی تو اپنے کام سے
کوئی بھی واقف نہ تھا دنیا میں تیرے نام سے
تیرے رُخ پر تربیت کی آئینہ کاری نہ تھی
تیرے لب پر علم کی سنجیدہ گفتاری نہ تھی

تو تھا دنیا کے سمندر میں وہ موجِ بے خروش
جس کے بل بوتے پہ اتراتا ہے طوفانوں کا جوش
تیری محنت پر ہمیشہ دوسروں کی تھی نگاہ
تیرا خرمن تھا ہزاروں بجلیوں کی رزم گاہ
سر سے لے کر پاؤں تک اک حسرتِ ناکام تھا
تیرے آئینے میں عکسِ گردشِ ایام تھا

تو نے آخر ختم کر دی داستانِ زندگی
تنگ ہے محکوم قوموں پر جہانِ زندگی
مر کے بھی گو زندگی کی طرح تو مجبور ہے
لیکن انگریزی حکومت کی حدوں سے دور ہے

سنہ ۱۹۴۱ء

بنارس سنٹرل جیل

انقلابِ روس

سرخ انقلاب کی ۲۷ ویں سالگرہ کے موقع پر

رُخِ حیات کو بخشیں تجلیاں تو نے
بکھیر دی ہیں فضاؤں میں سُرخیاں تو نے
جلائی عزم کی مشعل عمل کی راہوں میں
دیا ہے منزلِ مقصود کا نشاں تو نے
شگاف ڈال دیا تاجِ شہریاری میں
گرائیں ظلم کے خرمن پہ بجلیاں تو نے
فریب زار بھی توڑا فسونِ قیصر میں
اجاڑ دی ہیں لٹیروں کی بستیاں تو نے

جو خونِ خلق کے دریا میں ناؤ کھیتے تھے
اتارے ان کے سفینوں سے بادباں تو نے

دکھائی جس نے غلاموں کو راہِ آزادی
دیا زمانے کو وہ میرِ کارواں تو نے

جہانِ پیر کی طرحِ کہن بدل ڈالی
مٹائے فرقہ و طبقات کے نشاں تو نے

عنانِ وقت ہے محنت کشوں کے ہاتھوں میں
یہ راز وہ ہے جسے کر دیا عیاں تو نے

بجھے بجھے سے پڑے تھے جو رہگذاروں میں
بنا دیا انھیں ذرّوں کو کہکشاں تو نے

جہالتوں کا اندھیرا تھا جن کے ذہنوں پر
دکھائیں علم کی ان کو تجلیاں تو نے

کبھی جو سوت کے کپڑوں کو بھی ترستے تھے
عطا کیا ہے انھیں رختِ پرنیاں تو نے

نکالی سخت چٹانوں سے جوئے آبِ رواں
بنائے ریگ کے دامن میں بوستاں تو نے

دیے ہیں رنگ سمرقند کی بہاروں کو
سجائے پھر سے بخارا کے گلستاں تو نے
بلا کا جوش ہے تیرے سبو کی مستی میں
شرابِ سرخ میں حل کی ہیں بجلیاں تو نے
جہاں میں دھوم ہے جمہور کے ترانوں کی
کچھ ایسے شوق سے چھیڑا ہے سازِ جاں تو نے
مٹا سکیں نہ تجھے سازشیں حریفوں کی
دکھائیں تیغ کے جوہر کی خوبیاں تو نے
گلوں پہ خونِ شہیداں سے کی حنابندی
پلٹ کے باغ میں آنے نہ دی خزاں تو نے
تری بہارِ گلستاں بدوش ہے اب بھی
عروسِ لالہ و گل سرخ پوش ہے اب بھی

تاجکستان کا ایک گیت

اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا
راہ میں تیرے لئے سنگ گراں ہیں لاکھوں
تاجکستان کے پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں
نیزہ و خنجر و شمشیر و سناں ہیں لاکھوں

اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رُخ کرنا
بیلیں انگوروں کی زنجیر لئے بیٹھی ہیں
مرد شمشیر بکف تیری پذیرائی کو
عورتیں جذبہ نخچیر لئے بیٹھی ہیں

اے امیرابِ نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا
کوہساروں کی بلندی کو جلال آئے گا
سنگریزوں کے کلیجے سے دھواں اٹھے گا
اور دریاؤں کے سینے میں اُبال آئے گا

(ترجمہ)

تعمیرِ نو

انقلابِ روس نے چھیڑا ہے مشرق میں رباب
ایشیا کی روح میں ہے زندگی کا اضطراب
زندہ باد اے انقلاب

رسمِ پرویزی گئی آئینِ چنگیزی گیا
اب ہمیشہ کے لئے دستورِ خوں ریزی گیا
زندہ باد اے انقلاب

عارضِ لعلِ بدخشاں پر ہے کیسی آب و تاب
سرخ رو خونِ شہیدانِ وطن سے ہے گلاب
زندہ باد اے انقلاب

پھر سے نکھرا ہے سمرقند و بخارا کا جمال
اس افق پر ماہِ کامل بن کے چمکا ہے ہلال
زندہ باد اے انقلاب

ذرہ ذرہ سوزِ آزادی سے دے اٹھا ہے لو
کارخانے گا رہے ہیں نغمۂ تعمیرِ نو
زندہ باد اے انقلاب

جھومتی ہے کشت زاروں پر بہارِ لازوال
ریگ زاروں میں بچھا ہے نقرئی نہروں کا جال
زندہ باد اے انقلاب

کیوں نہ ہوں کشت و چمن آسودہ خرمن باغ باغ
خانۂ دہقاں میں روشن ہیں فراغت کے چراغ
زندہ باد اے انقلاب

اہلِ محنت کا نہالِ آرزو ہے بار ور
آدمی کے دستِ قدرت میں ہیں فطرت کے ثمر
زندہ باد اے انقلاب

اپنی دولت لے کے حاضر ہو رہے ہیں کوہسار
برق کی جوئے رواں برسا رہے ہیں آبشار

زندہ باد اے انقلاب

بزمِ گیتی کے ہیں خادم عرشِ اعظم کے سفیر
دامِ حکمت میں شعاعِ مہرِ تاباں ہے اسیر

زندہ باد اے انقلاب

سمٹی جاتی ہیں فضائیں کانپتا ہے آفتاب
مائلِ پرواز ہیں فولاد و آہن کے عقاب

زندہ باد اے انقلاب

عزمِ انسانی عناصر سے ہے سرگرمِ جہاد
دخترِ دہقاں کے ہاتھوں میں ہے سازِ برق و باد

زندہ باد اے انقلاب

آدمِ خاکی کا ہنگامِ نمود آ ہی گیا
اس زمیں پر آسماں پھر سجود آ ہی گیا

زندہ باد اے انقلاب

لینن

دوستوں کے لئے الفت کی زباں ہے لینن
دشمنوں کے لئے شمشیر و سناں ہے لینن
رگِ مزدور میں خون بن کے رواں ہے لینن
دل پہ سرمائے کے اک سنگِ گراں ہے لینن
کشتِ دہقاں کے لئے بادِ بہاری کا پیام
شہریاری کے لئے برقِ تپاں ہے لینن
سرخ فوجوں کے تجمل میں جھلک ہے اس کی
نوجوانوں کے ارادوں میں جواں ہے لینن
جس نے ہر قوم کو ہر ملک کو سیراب کیا
سرخ میخانے کا وہ پیرِ مغاں ہے لینن

جس کی ہر بات ہے تفسیر حیات ابدی
جس کو ہر شخص نے سمجھا وہ زباں ہے لینن
جس پہ شاہد ہے سمرقند و بخارا کا شکوہ
وہ ہنرمند وہ معمار جہاں ہے لینن
ظلمت آباد غلامی کے بیابانوں میں
مشعلِ راہ یقیں، سنگ نشاں ہے لینن
ہٹلریت کے نشاں جس سے جھکے جاتے ہیں
حریت کا وہ سرافراز نشاں ہے لینن

آخری خط

(جو ایک سُرخ سپاہی نے اپنی بیوی کو لکھا تھا)

اے پرستانِ محبت کی پری
اے فروغِ شمعِ بزمِ دلبری
اے سمرقند و بخارا کی بہار
اے مری تنہائیوں کی غمگسار
تیرے شوہر کا سلامِ آخری
ہے محبت کا پیامِ آخری
ملک پر اپنے فدا ہوتا ہوں میں
اب ہمیشہ کو جدا ہوتا ہوں میں

گو مرے مرنے سے تو ہے دردمند
اپنی ہم جنسوں میں ہو گی سربلند
خوش ہے استالین میرے کام پر
حرف آئے گا نہ تیرے نام پر
تیرا شوہر موت سے ڈرتا نہیں
پاؤں پر دشمن کے سر دھرتا نہیں
دشمنوں سے برسرِ پیکار ہوں
لذتِ کردار سے سرشار ہوں
سیل حملے کا کبھی تھمتا نہیں
تیغ پر میری لہو جمتا نہیں
ایک لمحے کو نہیں رکتی ہے جنگ
رچ گیا ہے خون کا آنکھوں میں رنگ
زلزلوں کی زد میں ہے سی بستوپول
بج رہے ہیں کان کے پردوں پہ ڈھول
ڈگمگاتے ہیں پہاڑوں کے قدم
سر پہ اولوں کی طرح گرتے ہیں بم

بحر کے سینے میں پیدا جوش ہے
ساحلِ دریا بھی آہن پوش ہے
دورِ جنگی سفینوں کی قطار
جیسے بہہ کر آ گئے ہوں کوہسار
الاماں پرہول بمباروں کی آگ
اُف وہ ہیبت ناک طیاروں کے راگ
الاماں لاشوں پہ لاشے الاماں
موت کے بجتے ہیں تاشے الاماں
پشتِ گیتی پر ہے انگاروں کی ڈھال
ہے ہوا کے دوش پر شعلوں کا جال
شہر سارا آگ کا خرمن ہے آج
ذرہ ذرہ شعلہ پیراہن ہے آج
سُرخ ہے شعلوں سے روئے آفتاب
سُرخ ہے شعلوں سے دامانِ سحاب
سُرخ شعلوں سے سحر ہے سُرخ شام
سُرخ ہیں شعلوں سے بام و در تمام

سُرخ شعلے کھا رہے ہیں پیچ و تاب
تپ رہی ہے اُن میں روحِ انقلاب

الغرض ہم بے خطر لڑتے رہے
روز و شب شام و سحر لڑتے رہے
جنگ کا سیلاب چڑھتا ہی گیا
دشمنوں کا زور بڑھتا ہی گیا
ایسے طوفاں میں ابھرنا ہے محال
اب یہاں پر جنگ کرنا ہے محال
بند کر دیں وار یہ ممکن نہیں
ڈال دیں ہتھیار یہ ممکن نہیں
چھوڑ کر یہ مورچہ ہٹ جائیں گے
ہٹ کے پیچھے سورما ڈٹ جائیں گے
ان کی پس قدمی پہ ہم ہوں گے نثار
اپنے جسموں سے بنائیں گے حصار

ہم ہیں کیسے سورما دکھلائیں گے
مرتے مرتے اک سبق دے جائیں گے
ہم جئیں گے بھی تو اپنی آن سے
ہم مریں گے بھی تو اپنی شان سے
زندگی کے راز سے واقف ہیں ہم
موت کے انداز سے واقف ہیں ہم
غول دشمن کا جب آئے گا یہاں
خاک کے سینے سے اُٹھے گا دھواں
بام باقی اور نہ در رہ جائے گا
شہر کے بدلے کھنڈر رہ جائے گا
شہر لینن کے سپوتوں کے لئے
اور کھنڈر فاشسٹ بھوتوں کیلئے

نور ہے آئینۂ ایام میں
زندگی کی مے ہے میرے جام میں
دل میں ہے سوز و گدازِ آرزو
ہے رگ و پے میں جوانی کا لہو

عالمِ ہستی کا دل دادہ ہوں میں
پھر یہ کیوں مرنے پہ آمادہ ہوں میں
زندگی میں رنگ بھرنے کے لئے
موت کو تسخیر کرنے کے لئے
موت کی جانب بڑھا جاتا ہوں میں
موت کے منہ میں چلا جاتا ہوں میں
کام جب آئے گا لاکھوں کا شباب
سُرخ تارہ تب بنے گا آفتاب
جان جائے آبرو جانے نہ پائے
جیتے جی دشمن یہاں آنے نہ پائے
معرکے کا زور گھٹ سکتا نہیں
یہ قدم اب جم کے ہٹ سکتا نہیں

گو نہیں ہے مجھ کو مرنے کا ملال
دل میں رہ رہ کر یہ آتا ہے خیال
ہے جوانی کا چمن بے رنگ و بو
بے ثمر ہے میرا نخلِ آرزو

باغ کے آغوش میں گل چاہیئے
زندگانی میں تسلسل چاہیئے
ہو اگر دل کو تسلسل کا یقیں
موت بن جاتی ہے جامِ انگبیں
سر سے ڈھل جاتی ہے مایوسی کی دھوپ
موت بھر لیتی ہے پیدائش کا روپ

ہاں یہ سچ ہے تو مجھے کرتی ہے پیار
تیرا پیمانِ وفا ہے استوار
عمر بھر اب تجھ کو یاد آؤں گا میں
تیرے دل میں درد بن جاؤں گا میں
ہوگی غم انگیز رعنائی تری
تیری ہم دم ہوگی تنہائی تری
لیکن اے تسکینِ جانِ بیقرار
عمر بھر یوں ہی نہ رہنا سوگوار
تو ہے جن اچھائیوں کی مایہ دار
دوسروں پر بھی تو ہوں وہ آشکار

گر نہ ہو سطحِ زمیں پر جلوہ تاب
بے حقیقت ہے طلوعِ آفتاب
شمعِ محفل سے اگر مستور ہے
فائدہ پھر کیا جو اس میں نور ہے
ساز سے پیدا نہ ہوں نغمے اگر
جنبشِ مضراب ہے ناکارگر
اسلئے تنہا نہ رہنا چاہیئے
تیرا دل سونا نہ رہنا چاہیئے
گر بخارا میں ہو کوئی نوجوان
جو سمجھتا ہو ترے غم کی زبان
جو ہو واقف تیرے دل کے درد سے
جو جھجکتا ہو نہ آہِ سرد سے
سوگ تیرا ہو نہ جس کے دل پہ بار
جس کو کر سکتی ہو تو تھوڑا سا پیار
عشق میں اپنے سمو لینا اُسے
ہار میں اپنے پرو لینا اُسے

اس ہوا سے گر کوئی غنچہ کھلے
یاد کرنا اس کو میرے نام سے
میرے گلشن کا ثمر کہنا اسے
ہاں مرا نورِ نظر کہنا اسے
اور جب دشمن کو ملجائے شکست
اسکے سارے حوصلے ہو جائیں پست
مجھ سے ملنے کے لئے آنا یہاں
پھول لا لے کے چڑھا جانا یہاں

جانتا ہوں وہ گھڑی بھی آئے گی
دشمنوں کی نبض جب چھٹ جائے گی
بحر اسود سے اٹھے گی فوج فوج
سرخ طوفاں کی ظفر انجام موج
دامنِ ساحل بھگو یا جائے گا
دشمنوں کے خوں میں دھویا جائے گا
سرخ فوجیں لوٹ کر آئیں گی پھر
سرخ پرچم بن کے پہرائیں گی پھر

شہر یہ دل شاد ہو گا ایک دن
یہ کھنڈر آباد ہو گا ایک دن
پھر نسیم جاں فزا اٹھلائے گی
لالہ و گل پر بہار آ جائے گی
مسکرائے گی تبسّم کی کلی
گونج اُٹھے گی قہقہوں کی راگنی

ریگِ ساحل پرنیاں ہو جائے گی
یہ زمیں پھر آسماں ہو جائے گی

سنہ ۱۹۴۴ء

جبر

بلوں آسمان، سبز زمین
ب کے بستر پہ سوئے جاتے ہیں
شام کے نرم قرمزی سائے
ں اندھیرے میں کھوئے جاتے ہیں

یک بے گھر کسان دوشیزہ

کھوئی کھوئی ہوئی اُداس اداس
چیتھڑوں میں بدن چھپائے ہوئے
چپ کھڑی ہے سڑک کے موڑ کے پاس

سوچتی ہے کہ میں کدھر جاؤں
اے خدا جلد رات کٹ جائے
گر پڑے کاش آسماں سر پر
ہو سکے تو زمین پھٹ جائے

ایک بدرنگ جیپ آ کے رکی
سانپ کی طرح ایک ہاتھ بڑھا
اور پھر گرد کے پھریروں نے
اس کی بےچارگی کو ڈھانپ لیا

اب بھی اس راستے میں راتوں کو
زخمی چیخیں سنائی دیتی ہیں
تیرگی کے سیاہ دامن پر
خوں کی بوندیں دکھائی دیتی ہیں

اپنے بیٹوں کی بے حیائی پر
مائیں ہندوستاں کی روتی ہیں
بیٹیوں کے لہو کے دھبوں کو
خون کے آنسوؤں سے دھوتی ہیں

عظمتِ انساں

(مئی ۱۹۴۵ء میں فتح برلن کے موقع پر لکھی گئی ۔)

دل غلامی میں سکوں کا لطف پاتا ہی نہیں
کوئی غنچہ آرزو کا مسکراتا ہی نہیں
ہے کچھ ایسا درد پہلو میں کہ جاتا ہی نہیں
اب خوشی کا سانس سینے میں سماتا ہی نہیں

کیا کشش ہے فتح برلن کے سنہرے راگ میں
غم کا خرمن جل رہا ہے اس خوشی کی آگ میں
سُرخ پرچم کی ہوا سے شوق لہرانے لگا
دستِ استالن میں ٹوٹا ساز بھی گانے لگا

ذرّہ آغوشِ ہوا میں جا کے اترانے لگا
پست ہمت ولولوں کو بھی جلال آنے لگا
ڈوبتی کشتی کو بھی آخر کنارا مل گیا
ظلم کے مارے ہوئے دل کو سہارا مل گیا
پار لگ جائے گی اب مظلوم انسانوں کی ناؤ
حرّیت کی سمت ہے دنیا کے دھارے کا بہاؤ
وقت کی نازک ترازو میں ہے جمہوری جھکاؤ
پڑ رہا ہے آج کے مقیاس پر کل کا دباؤ
شمع جو لینن نے روشن کی تھی بزمِ روس میں
جل رہی ہے ارتقا کے احمریں فانوس میں
موت کے مسکن پہ جھپٹے زندگی کے پاسبان
شب کے سینے میں در آئے صبحِ نو کے ترجمان
گر گئی کٹ کر شہیدوں کے گلے سے ریسمان
لے کے انگڑائی اٹھی مرقد میں روحِ تھالمان
گلشنِ ویمر میں گلہائے طرب کھلنے لگے
سینہ چاکانِ چمن اُٹھ کر گلے ملنے لگے

سُرخ توپوں سے شرر نکلے، ستارے بن گئے
بم کے گولے آسماں پر ماہ پارے بن گئے
جب غبار اٹھا تو کچھ رنگیں غبارے بن گئے
ہمہمے شیروں کے موسیقی کے دھارے بن گئے

بربریت کے دل وحشی کو دہلاتے ہوئے
آ گئے علم و ہنر کے پھول برساتے ہوئے

ختم آخر ہو گیا فاشزم کا پرہول خواب
چونک اٹھی نیند سے پیرس کی ارضِ انقلاب
رومتہ الکبریٰ پہ چمکا حرّیت کا آفتاب
آج ہے یونان کے ہاتھوں میں ہومر کا رباب

روس کے محنت کشوں نے کام پورا کر دیا
فتح کے پھولوں سے اک دنیا کا دامن بھر دیا

اب نہ آئیں گے بھری محفل میں زہر آلود جام
صبح کے زرّیں سر پہ اب نہ منڈلائے گی شام
اب نہ دھوکا کھائیں گے سرمایہ داری کا عوام
تیرگی اب اٹھ کے جا سکتی نہیں بالائے بام

کوئی اب اُڑتے شرارے کو دبا سکتا نہیں
کوئی بادل سُرخ تارے کو چھپا سکتا نہیں

جاگ اُٹھے کوہ و صحرا ناچ اُٹھے آبشار
ہو گئے بیدار شام و نجد و ایران و تتار
چین کا خونیں اُفق بھی بن گیا ہے لالہ زار
کیوں نہیں ہے ہند کے اُجڑے گلستاں میں بہار؟

سازشیں کرتے ہیں گل چیں سر سے سر جوڑے ہوئے
باغباں بیٹھے ہیں اک مدّت سے منہ موڑے ہوئے

مژدہ اے جوشِ حمیت تہنیت اے ذوقِ جنگ
اور بھی اونچی ہوئی بیتاب سینے کی اُمنگ
موجۂ راوی سے ہم آہنگ ہے موجِ گنگ
ہو گیا ہے عرصۂ ہستی ملوکیت پہ تنگ

اب نہیں ہے کوئی گہرا رنگ اس تصویر میں
چند کڑیاں رہ گئی ہیں ظلم کی زنجیر میں

اُٹھ گیا ہٹلر کے ساتھ اہلِ ضرر کا اقتدار
آج سے چنگیزیت کا نخل ہے بے برگ و بار

ہو گیا ہے سرد شعلہ، بجھتے جاتے ہیں شرار
ہند کی گردن پہ ہے شاہی کا "دستِ رعشہ دار"

ایک ہی ہلکے سے جھٹکے میں کلائی موڑ دے
اے مجاہد سامراجی انگلیوں کو توڑ دے

مٹ چکی ہے اسکی طاقت، اڑ چکے ہیں اس کے ہوش
ہو چکا ہے بند اس منحوس سینے کا خروش
اب سمندر میں نہ لہریں ہیں، نہ طوفاں ہے، نہ جوش
اب ابد تک اس کے ہنگاموں کی دنیا ہے خموش

دورِ خاص آخر ہوا اب دورِ عام آنے کو ہے
جس سے سب سیراب ہو جائیں وہ جام آنے کو ہے

اے زمیں، اے آسماں، اے آفتاب، اے ماہتاب
اے جلالِ عصرِ حاضر، اے ہوائے انقلاب
اے مقدس وید، اے انجیل، اے ام الکتاب
آج پورا ہو رہا ہے عظمتِ انساں کا خواب

اک نئی جنت میں اب آدم کو گھر مل جائے گا
سیکڑوں صدیوں کی محنت کا ثمر مل جائے گا

شاعر

لے کے آیا ہوں زمانے کے لئے پیغامِ گل
میں ہوں خوشبوئے چمن پیغمبرِ فصلِ بہار

میں غلامی کے اندھیرے میں ہوں آزادی کا نور
میں حق و باطل کی پیکاروں میں تیغِ آبدار

کذب کی تاریک راتوں میں صداقت کا ظہور
وقت کے سادہ اُفق پر رنگِ صبحِ زرنگار

موت کی پرہول وادی میں ہوں طوفانِ حیات
غم کے سینے پر مسرّت کا سنہرا آبشار

یوں مری آغوش میں سمٹی ہوئی ہے زندگی
جس طرح قوسِ قزح میں سات رنگوں کا نکھار

میں انیسِ شامِ ہجراں، میں ندیمِ صبحِ وصل
میں شریکِ بزمِ عشرت، میں رفیقِ کارزار

ہم نشینِ لالہ و گل، ہم نوائے عندلیب
ہم رکابِ رنگ و نکہت ہم دمِ بادِ بہار

میں ہوں صدیوں کا تفکر، میں ہوں قرنوں کا خیال
میں ہوں ہم آغوش ازل سے، میں ابد سے ہم کنار

میرے نغمے قیدِ ماہ و سال سے آزاد ہیں!
میرے ہاتھوں میں ہے لافانی تمنا کا ستار

گاہ تبلیغِ محبت ، گاہ کی تبلیغِ حسن
بے حسوں کے دل کو بخشا سوزِ شامِ انتظار

نقشِ مایوسی میں بھر دیتا ہوں امیدوں کا رنگ
میں عطا کرتا ہوں شاخِ آرزو کو برگ و بار

چن لئے ہیں باغِ انسانی سے ارمانوں کے پھول
جو مہکتے ہی رہیں گے ، میں نے گوندھے ہیں وہ ہار

عارضی جلوؤں کو دی ہے تابشِ حسنِ دوام!
میری نظروں سے ہے روشن آدمی کی رہگذار

گوالیار

ایک گیارہ برس کے بچے کے نام جس نے پہلی گولی اپنے سینے پر کھائی

یہ دیسی حکمراں جو نسلِ انسانی سے خارج ہیں
وہ کہتے ہیں جنھیں انگریز آقاؤں نے پالا ہے
بھیانک ان کی روحیں ہیں تو مردہ ہے ضمیر ان کا
سفید ان کی رگوں کا خون ہے دل انکا کالا ہے
کروڑوں مفلسوں کا خون جلتا ہے چراغوں میں
جو ان منحوس رجواڑوں کے محلوں کا اجالا ہے
یہ سب بے آسرا مظلوم بیواؤں کے آنسو ہیں
چمکتے موتیوں کی ان کی گردن میں جو مالا ہے

یہ بچوں کے دلوں کی سسکیاں ماؤں کی چیخیں ہیں
انھوں نے جن کو ساز و رنگ کے سانچے میں ڈھالا ہے
برہنہ ہو گئی ہوں گی نہ جانے عصمتیں کتنی
کہ ان کی رانیوں کے سر پہ کشمیری دوشالہ ہے
خدا معلوم کتنے پیٹ بھوکے رہ گئے ہوں گے
کہ ان کے خوں بھرے جبڑوں میں سونے کا نوالہ ہے
یہ سب برطانیہ کے تاج شاہی کے نگینے ہیں
ہر اک ان میں سے بھارت ورش کے سینے کا چھالا ہے
جو ہو ویران اس بستی میں الّو شور کرتے ہیں
غلام آباد ہندستاں میں ان کا بول بالا ہے
یہ کشتی بچ نہیں سکتی ہے آخر ڈوب جائے گی
شکستہ ناؤ کو منجدھار میں کس نے سنبھالا ہے

بغاوت کے جنوں کا تند دریا چڑھتا جاتا ہے
لہو بہنا ہے جتنا، اتنا طوفاں بڑھتا جاتا ہے

یہ کس نے بڑھ کے گولی روک لی معصوم سینے پر
یہ کس کے دل کا ٹکڑا کس کی آنکھوں کا ستارا ہے
یہ کیسی عورتیں ہیں جن سے سنگینیں جھجکتی ہیں
انھیں میدان میں جوشِ شجاعت نے پکارا ہے
یہ مزدوروں کی طوفاں خیز موجوں کا تلاطم ہے
بہالے جائے گا جو ظلم و نخوت کو، وہ دھارا ہے
ڈھلے ہیں ان کے بازو کارخانوں میں بغاوت کے
تپاکر زندگی کی آگ نے ان کو نکھارا ہے
وہ کچلا جا نہیں سکتا تشدّد کے ہتھوڑوں سے
ہمارے جوشِ آزادی نے جو جذبہ اُبھارا ہے
ابھی ہندوستاں میں اور انگارے دہکتے ہیں
گو البتّہ میں جو بھڑکا ہے وہ پہلا شرارہ ہے

غلامی کی اندھیری رات میں شعلہ لپکتا ہے
شہیدوں کا لہو رنگ شفق بن کر جھلکتا ہے

(جنوری ۱۹۴۶ء)

ملّاحوں کی بغاوت

بمبئی تیرے شہیدانِ محبت پر سلام
مر کے جو دے گئے ہم سب کو بغاوت کا پیام

دیکھنا ہند کی تقدیر بدل جائے گی
سر بکف اُترے ہیں میدانِ سیاست میں عوام

زخم کھائے ہوئے سینوں میں ہیں خورشید نہاں
خون آلودہ جبینیں ہیں کہ ہیں ماہِ تمام

آج تلوار کی محراب ہے محرابِ حرم
آج کے روز ہے سجدے سے کہیں بڑھ کے قیام

آج سے کوچۂ و بازار میں مرنا ہے روا
ظلم کی چھاؤں میں چُپ بیٹھ کے جینا ہے حرام

جاگ اے روحِ عمل، جوشِ حمیت بیدار
رہبرِ قوم بنا تا ہے فرنگی کو امام

کوہساروں کی چٹانوں سے کہو ہٹ جائیں
تم سے رکنے کا نہیں موجۂ دریا کا خرام

مردِ آزاد کو ہے جامِ شہادت کی تلاش
اور غلاموں کے مقدّر میں فقط مرگِ دوام

خوف سے خود تو دبک جاتے ہیں ہنگامِ جہاد
اور دیتے ہیں شہیدانِ وطن کو الزام

یہ سپوتوں کو بتاتے ہیں ذلیل اور اوباش!
ڈال دو بڑھ کے کوئی ان کے دہانوں میں لگام

ہم نشیں ان سے نہ رکھ کوئی عمل کی امید
کھا گیا روح کو رہبر کی غلامی کا جذام

اب وہ سنتے نہیں مجروح وطن کی فریاد
منتظر بیٹھے ہیں آئے گا بکنگھم سے پیام

کر رہے ہیں وہ فرنگی سے طلب آزادی
موت سے مانگتے ہیں بادۂ جاں بخش کا جام

کل تلک راگ بغاوت کے الاپے لیکن
اب وہ دن رات جپا کرتے ہیں انگریز کا نام

صرف بکھرے ہوئے دانوں پہ نظر ہے ان کی
اور پوشیدہ نگاہوں سے ہے صیّاد کا دام

جنگ میں قوم کے سرداروں سے بن آئے گا کیا
تیغ کے بدلے لئے پھرتے ہیں ہاتھوں میں نیام

جن میں لڑنے کی سکت ہے نہ ہے مرنے کی اُمنگ
وہ یہ کہتے ہیں کہ کافی ہے فقط زورِ کلام

رہبرِ قوم کی ناکارہ سیاست کے طفیل
آج بھی ہم ہیں فرنگی کی حکومت کے غلام

مَل کے چہرے پہ اٹھو خونِ شہیدانِ وطن
توڑ دو بڑھ کے شہنشاہ پرستی کا نظام

فروری سنہ ۱۹۴۶ء

گردِ کارواں

(قومی حکمرانوں کے نام !)

یہ مانا آج سرافرازِ مثلِ آسماں تم ہو
یہ مانا عزت کی منزلوں کے راز داں تم ہو
یہ مانا فخرِ عالم، نازشِ ہندوستاں تم ہو
مگر گذرے ہوئے عہدِ طرب کی داستاں تم ہو

تمھیں نے ہند کے دریاؤں سے طوفاں اُٹھایا تھا
تمھیں نے راگ آزادی کا ہم سب کو سکھایا تھا
تمھیں نے ساز چھیڑا تھا، تمھیں نے گیت گایا تھا
بھری محفل میں لیکن آج اپنے نوحہ خواں تم ہو

تمھیں میدان میں انگڑائی پر انگڑائی آئی تھی
تمہارے حوصلوں پر خود شجاعت مسکرائی تھی
تمھیں نے اپنے خوں سے شمعِ آزادی جلائی تھی
مگر اب شمعِ آزادی کے سینے کا دھواں تم ہو

تمھیں آگے بڑھے تھے زندگی کا جام لینے کو
تمھیں اٹھے تھے سوزِ عشق کا پیغام دینے کو
تمھیں نکلے تھے کل جمہوریت کی ناؤ کھینے کو
اسی جمہوریت سے آج لیکن بدگماں تم ہو

کسانوں سے پریشاں ہو تو مزدوروں سے نالاں ہو
بغاوت سے ہو خائف اشتراکیت سے لرزاں ہو
عدو کو چھوڑ کر اپنوں ہی سے دست و گریباں ہو
خفا ہو دوستوں سے دشمنوں پر مہرباں تم ہو

جنہوں نے اپنے سکے چور بازاروں میں ڈھالے تھے
جنہوں نے اپنی ماں بہنوں کے سینے چیر ڈالے تھے
ابھی کل تک جنھیں تم خود ہی سولی دینے والے تھے
یہ کیا ہے آج ان سرمایہ داروں کی زباں تم ہو

جھلس کر رہ گئے تہذیبِ انسانی کے باغ اس میں
چمن بن کر کھلے ہیں سینۂ مفلس کے داغ اس میں
جلے ہیں کتنی بیواؤں کے اشکوں سے چراغ اس میں
نکل کر جیل سے جس انجمن میں میہماں تم ہو

برا لگتا ہے سازِ زندگی کا زیر و بم تم کو
نظر آتا ہے سیدھا آج ہر ٹیڑھا قدم تم کو
ڈسے لیتے ہیں قومی راستوں کے پیچ و خم تم کو
جرس کل تک تھے لیکن آج گردِ کارواں تم ہو

نہ تم ٹوٹے ہوئے دل جوڑ سکتے ہو محبت سے
نہ تم شاہی کا جادو توڑ سکتے ہو سیاست سے
نہ تم طوفان کا رخ موڑ سکتے ہو فراست سے
نہ جانے کس لئے آخر امیرِ کارواں تم ہو

خودپرستی

میں نے پوچھا رات اک ٹوٹے ہوئے تارے سے یہ
اے سراپا روشنی اے بزمِ انجم کے سفیر
مٹ گئی کیوں آسماں سے ایک ہی لمحے کے بعد
تو نے کھینچی تھی جو اک ہلکی سی سونے کی لکیر "
وہ ستارہ بجھتے بجھتے مجھ سے اتنا کہہ گیا
"خود پرستی کے غلط جذبے کی بیداری تھی وہ
جس کو سمجھا تو نے اک ہلکی سی سونے کی لکیر
میری آوارہ تمنا کی فسوں کاری تھی وہ "

چلمنیں اُٹھتی ہیں مشرق کی حریمِ ناز سے
منتظر تھیں جس کی آنکھیں جلوہ گر ہونے کو ہے
خونِ شب سے گل بداماں ہے شفق زار وجود
آسماں پر نور سا پھیلا سحر ہونے کو ہے
کتنے آنسو بہہ چکے ہیں زندگی کی آنکھ سے
آج ان اشکوں کا ہر قطرہ گہر ہونے کو ہے
ارتقا ہے اس کا جادہ، اس کی منزل انقلاب
کاروانِ شوق سرگرمِ سفر ہونے کو ہے
گلشنِ ہندوستاں میں لوٹ آئی ہے بہار
آرزو کی شاخِ نازک بارور ہونے کو ہے
کھُل گیا در، پڑ گیا دیوارِ زنداں میں شگاف
اب قفس میں جنبشِ صد بال و پر ہونے کو ہے
جس کا چہرہ تھا غریبوں کے لہو سے تابناک
وہ نظامِ کہنہ اب زیر و زبر ہونے کو ہے
خواب کے آغوش سے بیداریاں پیدا ہوئیں
زندگی کی راکھ سے چنگاریاں پیدا ہوئیں

۱

آزمائش ہے تری جراتِ رندانہ کی
آب ہے موجِ مےِ ناب میں تلواروں کی
چشمِ ساقی میں ہے اب ہوش و خرد کا پیغام
آج پرسش نہیں بہکے ہوئے میخانوں کی

۲

جنت و کوثر و افرشتہ و حور و جبریل
مانتا ہوں تری تخئیل کی رعنائی کو
لیکن اک عمر سے اجڑی ہوئی دنیا کی زمیں
ڈھونڈتی ہے ترے ذوقِ چمن آرائی کو

۳

چشمِ بینا میں ستاروں کی حقیقت کیا ہے
عالمِ خاک کا جو ذرّہ ہے مہ پارہ ہے
آسمانوں میں بھٹکتی ہوئی روحوں سے کہو
یہ زمیں خود بھی چمکتا ہوا سیّارہ ہے

(ماخوذ از گورکی)

۴

تو حقیقت کو سمجھتا ہے طلسمی تصویر
تیرے نزدیک یہ احساس کی رعنائی ہے
تو یہ کہتا ہے مرے دل میں ہے ہیجان بہار
میں یہ کہتا ہوں "گلستاں میں بہار آئی ہے"

۵

موت کو جانتے ہیں اصلِ حیاتِ ابدی
زندگانی کو مگر خوار و زبوں کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو زمانے کو تصور کا فسوں کہتے ہیں

۶

ان کو ملتا ہی نہیں ہے دُرِ مقصود کہیں
جو صدف ہے وہی خالی نظر آتا ہے انھیں
حلقۂ زلف ہو یا سُرمۂ چشمِ خوباں
حلقۂ دامِ خیالی نظر آتا ہے انھیں

۷

یہ حکومت کے پجاری ہیں، یہ دولت کے غلام
جو جہنم کی مصیبت سے ڈراتے ہیں مجھے
خود تو دنیا میں بنا لیتے ہیں جنت اپنی
خواب کھوئی ہوئی جنت کے دکھاتے ہیں مجھے

۸

ظلم اور جہل پہ اصرار کروگے کب تک
عقل اور فہم سے بیکار کروگے کب تک
کب تلک عظمتِ افلاک کے گُن گاؤ گے
عظمتِ "خاک" سے انکار کروگے کب تک

۹

گرچہ ہے مُشتِ غبار آدم و حوّا کا وجود
ان کی رفعت پہ برستے ہیں ستاروں کے سجود
لالہ و گل تو فقط نقش قدم ہیں اس کے
اصل میں "خاک" کی معراج ہے انساں کی نمود

۱۰

سالہا سال فضاؤں میں شرر بار رہی
ایک پرسوز ہیولیٰ میں گرفتار رہی
"خاک" ہر چند کہ تھی پست و حقیر و نادار
اپنی فطرت سے مگر برسرِ پیکار رہی

۱۱

منتشر ہو گئی وسعت میں ستاروں کی طرح
تلملاتی رہی بیتاب شراروں کی طرح
"خاک" صدیوں کی مگر جنبشِ پیہم کے طفیل
متحد ہو گئی گوندھے ہوئے ہاروں کی طرح

۱۲

کہیں دریا، کہیں وادی، کہیں کہسار بنی
کہیں شعلہ، کہیں شبنم، کہیں گلزار بنی
"خاک" اک شکل سے سو شکل میں تبدیل ہوئی
کہیں الماس، کہیں گوہر شہوار بنی

۱۳

ذہن و جذبات و اشارات و کنایات بنی
موت و الفاظ و حکایات و روایات بنی
"خاک" جب صورت انسان میں نمودار ہوئی
زمزمے وید کے قرآن کی آیات بنی

۱۴

چھلکی ساغر میں مے ناب و گوارہ بن کر
چمکی آنکھوں میں محبت کا ستارہ بن کر
"خاک" سے زیست بنی "زیست سے احساس نشاط
اور پھر ناچ اٹھی حسن دل آرا بن کر

۱۵

اک کرن ٹوٹ کے سو رنگ بکھر جاتے ہیں
بکھرے جلوے بصد انداز سنور جاتے ہیں
جادوانی ہے یہ دنیا کا تماشا جس میں
نقش مٹتے ہیں تو مٹتے ہی ابھر آتے ہیں

۱۶

کوئی ہر گام پہ سو دام بچھا جاتا ہے
راستے میں کوئی دیوار اٹھا جاتا ہے
موت کی وادیٔ ظلمت میں علم کھولے ہوئے
کارواں زیست کا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

۱۷

موت کی آگ میں تپ تپ کے نکھرتی ہے حیات
ڈوب کر جنگ کے دریا میں ابھرتی ہے حیات
زلف کی طرح بگڑتی ہے، سنورتی ہے حیات
وقت کے دوشِ بلوریں پہ بکھرتی ہے حیات

۱۸

ابھی پوشیدہ ہیں نظروں سے خزانے کتنے
گوش انساں سے ہیں محروم ترانے کتنے
ختم ہو سکتا نہیں سلسلۂ عمرِ دراز
بطنِ تخلیق میں پنہاں ہیں زمانے کتنے

۱۹

حسن ہی حسن ہے فطرت کے صنم خانے میں
نور ہی نور ہے اس "خاک" کے کاشانے میں
رات آتی ہے ستاروں کی ردا اوڑھے ہوئے
صبح مے پیتی ہے خورشید کے پیمانے میں

۲۰

کس قدر نورِ سحر دیکھ کے شرماتے ہیں
شب ہوئی ختم ستاروں کو حجاب آتا ہے
بامِ گردوں پہ ہے اب نیّرِ اعظم کا جلوس
کوئی معشوق برافگندہ نقاب آتا ہے

۲۱

کبھی پہلو میں سمندر کے تڑپ اٹھتی ہیں
اور کبھی ریت کے سینے سے لپٹ جاتی ہیں
ان کو آتا نہیں آغوشِ محبت میں قرار
موجیں منہ چوم کے ساحل کا پلٹ جاتی ہیں

۲۲

یک بیک کیوں چمک اٹھی ہیں نگاہیں تیری
اک کرن پھوٹ رہی ہے تری پیشانی سے
اور بھی تیز ہوئی جاتی ہے رخسار کی آگ
جذبۂ شوق و محبت کی فراوانی سے

۲۳

رنگ پر رنگ نکھرتے ہی چلے آتے ہیں
روح ہوتی ہی نہیں سیر و نظارہ ہے
جسمِ محبوب ہے یا قامتِ رعنائے بہار
جیسے پھولوں کا اُبلتا ہوا فوّارہ ہے

۲۴

زلفِ شب رنگ کی گھنگھور گھٹا سے چھن کر
پڑ رہی ہے کسی چہرے پہ تبسّم کی پھوار
جیسے برسات کی راتوں میں چمکتے جگنو
یا شبِ ماہ کے ایوان میں بجتا ہے ستار

۲۵

اپنے اُڑتے ہوئے آنچل کو نہ رہ رہ کے سنبھال
حُسن کے پرچمِ زرتار کو لہرانے دے
گِر گیا پھول، مہکتے ہوئے جوڑے سے تو کیا
زلف کو تا بہ کمر آ کے مچل جانے دے

۲۶

تو نہیں ہے نہ سہی، تیری محبت کا خیال
ڈھونڈھ لیتا ہے تجھے حُسن کے نظاروں میں
مُسکراتا ہے دمِ صبح اُفق سے کوئی
رقص کرتا ہے کوئی رات کو سیاروں میں

۲۷

جس طرح خواب کے ہلکے سے دھندلکے میں کوئی
چاند تاروں کی طرح نور سا برساتا ہے
ہاں یونہی میرے تصوّر کے گلستانوں میں
پھول کھِل جاتے ہیں جب تیرا خیال آتا ہے

۲۸

میں تو بھولا نہیں، تم بھول گئی ہو مجھ کو
خیر گر تم بھی نہیں ہو مرے غم خواروں میں
تم نہ آؤ گی تو کیا اب نہیں آئے گی بہار؟
پھول کیا اب نہ کھلیں گے مرے گلزاروں میں؟

۲۹

بجھ گیا تیری محبت کا شرارہ تو کیا
ڈوبتے دیکھے ہیں گردوں کے ستارے میں نے
سرد ہوتے ہوئے دل برف کی قاشوں کی طرح
منجمد ہوتے ہوئے دیکھے ہیں دھارے میں نے

۳۰

شمع کی طرح پگھلتے ہوئے دل دیکھے ہیں
اشک بن بن کے نکلتے ہوئے دل دیکھے ہیں
تو نے دیکھی ہی نہیں گرمیٔ رخسارِ حیات
میں نے اس آگ میں جلتے ہوئے دل دیکھے ہیں

۳۱

ان کے کیا رنگ تھے اب یاد نہیں ہے مجھ کو
کتنے آنچل مری تخئیل میں لہرائے ہیں
ہائے بھولے ہوئے چہروں کے دل آویز نقوش
جھلملاتے ہوئے اشکوں میں جھلک آتے ہیں

۳۲

اپنے اعصاب کے مارے ہوئے بیچارے ادیب
یہ ترقی کے منادی ہیں تنزل کے نقیب
یہ "جمود" اور "مثلث" کے مظالم کے شکار
زندگی سے ہیں بہت دور فرائڈ سے قریب

۳۳

جذبۂ شوق کی تکمیل نہیں ہو سکتی!
زندگی موت ہے احساسِ مسرت کے بغیر
فقط اعصاب کی تسکین ہے توہینِ حیات
صرف حیوان ہے انسان محبت کے بغیر

۳۴

عشق اک جنسِ گراں مایہ ہے اک دولت ہے
یہ مگر عمر کا حاصل تو نہیں ہے اے دوست
منزلیں اور بھی ہیں، اس سے حسیں اس سے جمیل
"وصل" کچھ آخری منزل تو نہیں ہے اے دوست

۳۵

ماں کی آغوش میں ہنستا ہوا اک طفل جمیل
جس طرح ذہن ازل میں ہو ابد کی تخئیل
دیکھ لیں، وہ جو سمجھتے ہیں کہ فانی ہے حیات
زندگانی کے طربناک تسلسل کی دلیل

۳۶

تو نے خود تلخ بنا رکھی ہے دُنیا اپنی
زندگی کتنی حسیں ہے تجھے معلوم نہیں
ہے جو گہری سی شکن وقت کی پیشانی پر
تیری ہی چینِ جبیں ہے تجھے معلوم نہیں

۳۷

سارے عالم میں یہ اُڑتا ہوا گُل رنگ نشاں
سچ بتا سُرخیٔ رخسارِ سحر ہے کہ نہیں
یہ تڑپتا ہوا شعلہ، یہ چمکتا تارا
جنتِ جلوۂ فردوس نظر ہے کہ نہیں

۳۸

دیکھو تو تیرہ و تاریک فضا کا عالم
کس قدر درہم و برہم ہے ستاروں کا نظام
تو چمکتا ہے اُفق پر ابھی مانند ہلال
آسماں وقت کا ہے منتظرِ ماہ تمام

۳۹

حشر یہ ہٹلر و ٹوجو کا بتاتا ہے ہمیں
کہ زمانے میں پنپتا نہیں نفرت کا جنوں
اک نہ اک روز ابل آتا ہے سیلابِ حیات
خاک میں جذب نہیں ہوتا ہے مزدور کا خوں

۴۰

نکہت و رنگ کا طوفان اُمنڈ آیا ہے
آگ سی لگ گئی یورپ کے سمن زاروں میں
اس طرف سے بھی گذر قافلۂ صبحِ بہار
ایک بھی پھول نہیں میرے چمن زاروں میں

۴۱

زندگانی نے دیا ہے یہ مجھے حکم کہ تو
شبِ تاریک کے دامن میں ستارے بھر دے
پھونک دے جمع ہے جتنا خس و خاشاکِ نفاق
قلبِ انساں میں محبت کے شرارے بھر دے

۴۲

میں نے اپنا ہی بھگویا ہے ابھی تو دامن!
تیرا دامن بھی تو اے دوست بھگونا ہے مجھے
داغِ غم تو نے جو سینے میں چھپا رکھا ہے
اپنے اشکوں سے اسی داغ کو دھونا ہے مجھے

۴۳

میری دنیا میں محبت نہیں کہتے ہیں اسے
یوں تو ہر سنگ کے سینے میں شرر ملتا ہے
سیکڑوں اشک جب آنکھوں سے برس جاتے ہیں
تب کہیں ایک محبت کا گہر ملتا ہے

۴۴

گر د نفرت سے بچا لیتا ہوں دامن اپنا
میں محبت کا پجاری ہوں مسرت کا ندیم
لالہ و گل کا کیا کرتی ہے گلشن میں طواف
پھر بھی کانٹوں سے الجھتا نہیں دامانِ نسیم

۴۵

شیشۂ دل کو اگر ٹھیس کوئی لگتی ہے
آنسو بے ساختہ آنکھوں سے چھلک پڑتے ہیں
لیکن ایسے بھی ہیں کچھ اشک جو ہنگامِ نشاط
مسکراتی ہوئی پلکوں سے ٹپک پڑتے ہیں

۴۶

آدمی لاکھ ہو مایوس مگر مثلِ نسیم
رقص کرتا ہے تمنّاؤں کے گلزاروں میں
راستے وادی و صحرا میں بنا لیتے ہیں
چشمے رک کر نہیں رہ جاتے ہیں کہساروں میں

۴۷

پھانس کی طرح ہر اک سانس کھٹکتی ہے مجھے
نغمے کیوں گھٹ کے رہے جاتے ہیں دل ہی دل میں
رازداں اپنے نظر آتے ہیں ہر سمت مگر
پھر بھی تنہائی کا احساس بھری محفل میں

۴۸

گو مرے سر پہ سیہ رات کی پرچھائیں ہے
میرے ہاتھوں میں ہے سورج کا چھلکتا ہوا جام
میرے افکار میں ہے تلخیٔ امروز مگر
میرے اشعار میں ہے عشرتِ فردا کا پیام

۴۹

یہ تو ہیں چند ہی جلوے جو جھلک آئے ہیں
سنگ ہیں اور مرے دل کے گلستاں میں ابھی
میرے آغوشِ تخیل میں ہیں لاکھوں صبحیں
آفتاب اور بھی ہیں میرے گریباں میں ابھی

زندگی ہوتی ہے کیونکر کامراں یہ بھی تو دیکھ

صرف اک مٹتی ہوئی دُنیا کا نظارہ نہ کر
عالمِ تخلیق میں ہے اک جہاں یہ بھی تو دیکھ

موت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ ہی نہ سن
زندگی ہے تیز گام و نوجواں یہ بھی تو دیکھ

خاک پر پھیلے ہوئے دامِ غلامی پر نہ جا
حرّیت ہے کس قدر اوجِ آشیاں یہ بھی تو دیکھ

نبضِ گلشن بن کے چلتی ہے رگِ برگِ گلاب
خار و خس سے بن رہے ہیں گلستاں یہ بھی تو دیکھ

کشتیِ شب غرقِ دریائے شفق ہونے کو ہے
کھلنے والا ہے سحر کا بادباں یہ بھی تو دیکھ

ریزہ ریزہ ذرّہ ذرّہ خاکدانِ شرق کا
پرتوِ خورشید کا ہے رازداں یہ بھی تو دیکھ

آج ہے آباد کتنی شاہراہِ انقلاب
آ رہے ہیں ہر طرف سے کارواں یہ بھی تو دیکھ

میں نے مانا مرحلے ہیں سخت راہیں ہیں دراز
مل گیا ہے اپنی منزل کا نشاں یہ بھی تو دیکھ

راستوں کے پیچ و خم سے ہول آتا ہے مگر
آج ہے جمہور میرِ کارواں یہ بھی تو دیکھ

خواب

حادثہ وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

اقبال

۱

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
کتنے سربستہ رازوں کو سینے کے اندر چھپائے ہوئے ہوں
کتنے پرہول المناک افسانوں کو اپنے دل میں دبائے ہوئے ہوں
کتنے ہی جشن، کتنی ہی عیدیں
میری یادوں کے دامن میں محفوظ ہیں
ظلم اور جبر کی خون بھری داستانیں

بادشاہوں کی جنگی حکایات
دیو اور پریوں کے قصّے کہانی
انقلاب اور بغاوت کے دلکش ترانے
میرے ہونٹوں پہ سوئے ہوئے ہیں
میں انھیں جب بھی چاہوں جگا لوں

مُجھ کو معلوم ہے بابل و نینوا کے کھنڈر
وہ — فرات اور دجلے کی موجیں جنھیں لوریاں دے رہی ہیں
کس لئے آج ویران ہیں
ان میں اُن مطلق الحکم شاہوں کے ایوان تھے
جن کے ہونٹوں کی جنبش
موت کی ہم زباں تھی

ساحلِ نیل پہ وہ ابوالہول سکتے کے عالم میں اب تک کھڑا ہے
مصر کے سربلند آسماں بوس اہرام مبہوت ہیں
علم و تہذیب کی اس پرانی زمین پر
سرپھرے اور مغرور فرعون چھائے ہوئے تھے

جو خدا ابن کے انسان کو لوٹتے تھے

(ماخوذ از کارل سینڈبرگ)

اور وہ یونان کے قصر ہیں
روم کے اونچے اونچے ستون ہیں
وہ بھی اک داستاں کہہ رہے ہیں
ان کے سائے میں بردہ فروشی کے بازار تھے
جن میں انسان انسان کو بیچتا تھا۔

(ماخوذ از کارل سینڈبرگ)

وہ سمرقند کے سبز گنبد
اور بخارا کے ایوان ہیں
جن پہ خونخوار تاتاریوں کی اڑائی ہوئی گرد بیٹھی ہوئی تھی
اُف یہ چنگیز و تیمور کی عیش گاہیں
ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندی ہوئی آدمیت کی مظلوم
چیخوں سے گونجی ہوئی تھیں
اور وہ بسٹیل کے قید خانے کی دیواریں ہیں
جن کی اینٹیں شرابی، زناکار، جاگیرداروں پہ
جی کھول کر ہنس رہی ہیں

ان کے لوہے کے در پر کلیساؤں کے پادری پاسبان تھے
وہ امیروں کو جنّت کے پروانے اور مفلسوں کو
صبر و شکر و سکون اور روحانیت کا سبق دے رہے تھے

اور وہ ماسکو کا کرملین ہے
جس کے ماتھے کا روشن ستارہ
سُرخ کرنوں کی تنویر برسا رہا ہے
اس کے اندر ابھی کل تک
روس کے زار کھیتوں کے اور کارخانوں کے مالک
روئی، فولاد، تیل اور بارود کے بین الاقوامی بیوپاری بیٹھے ہوئے
جنگ کی سازشیں کر رہے تھے۔

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سُن چکا ہوں
آج دلّی کی آواز بھی سُن رہا ہوں
جس کے سینے پر ظالم فرنگی کے ٹھپو بغل بچوں کی ڈگمگاتی حکومت
کا ایک بوجھ رکھا ہوا ہے۔

آہ یہ میری اپنی ہی آواز ہے
میرے اہل وطن کے دلوں کی صدا ہے
جو ہمارے گلوں میں
ایک زخمی پرندے کے مانند
ڈیڑھ سو سال تک پھڑپھڑاتی رہی ہے

اب نہ وہ بابل و نینوا کے شہنشاہ ہیں
اور نہ وہ مصر کے سرپھرے او زعرور فرعون ہیں
اور وہ روم و یونان کے بردہ فروش
اور نہ خونخوار چنگیز و تیمور
اب نہ بسٹیل کے پاسباں ہیں
اور نہ وہ روس کے زار ہیں
صرف ان کے مظالم کی اک خون بھری داستاں رہ گئی ہے۔

آج خونخوار و خود سر فرنگی کا خونیں سفینہ بھی گرداب میں پھنس چکا ہے
اور اُن کے غلام اُن کے پٹھو
زخم کھائے درندوں کے مانند چلّا رہے ہیں

اُن کی آواز میں موت کا راگ ہے
اُن کے سینے میں بجھتی ہوئی آگ ہے
اور جمہور کے کاروانوں کی گرد سفران کی عظمت کی لاشوں کو کفنا
رہی ہے
اور وہ حادثہ جو ابھی پردہ آسمان میں چھپا ہے
میرے ادراک کے آئینے میں نظر آرہا ہے

(۲)

آج دلی کی کھوئی ہوئی رفعتیں اس کو پھر مل گئی ہیں
اس کا مکھڑا خوشی سے دمکنے لگا ہے
جس کی تنویر سے ایشیا جگمگایا ہوا ہے

کتنے ہی تخت دیکھے ہیں اس نے
کتنے ہی تاج پہنے ہیں اس نے
اس کے سینے پہ کتنے ہی شاہوں کے نقش قدم ہیں
کتنی تہذیبیں، کتنے تمدن
اس کی آغوش میں سو رہے ہیں

کتنے ٹوٹے ہوئے آفتاب اور مہتاب
اس کے کھنڈروں میں بکھرے پڑے ہیں
کتنے ہی گیت، کتنے ہی نغمے
اس کی سانسوں میں الجھے ہوئے ہیں
اس کے ماتھے پہ سورج بھی چمکا
چاند بھی جگمگایا
غم کی گھنگھور کالی گھٹائیں بھی چھائیں
دکھ کی راتیں بھی بیتیں
سکھ کی صبحیں بھی آئیں
یہ مگر اک نئے عہد کی، اک نئی نسل کی منتظر تھی

میری دلّی
میری محبوب دلّی
غالبؔ و میرؔ کی سرزمین
اب تو غاصب شہنشاہوں کی داشتہ
اور خود کام جاگیرداروں کی لونڈی نہیں ہے
غیر ملکوں کے سرمایہ داروں کی منڈی نہیں ہے

تو ہماری امیدوں کا مرکز ہے، خوابوں کی تعبیر ہے
آرزؤں کی تصویر ہے
تیرے چہرے پہ میں آج اک نور سا دیکھتا ہوں
جیسے تیری جبیں پہ کروڑوں ستارے سمٹ آئے ہیں
یہ اشوک اور اکبر کے عہد حکومت کی تنویر ہرگز نہیں ہے
بلکہ جمہور کی مشعلوں کی ضیا ہے۔
دیکھ ہندوستاں کے کروڑوں سپوتوں کی نظریں
آج تیری طرف اُٹھ رہی ہیں
یہ ہماری نگاہوں کی کرنیں ہیں جو تیرے رخسار پہ نور کا جال سا
بن رہی ہیں

روٹیوں کے لئے کتنے سوکھے ہوئے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں
کتنے ننگے بدن ایک کپڑے کی خاطر کھڑے ہیں
ان کو نفرت سے ان کو حقارت سے مت دیکھ
یہ فقیر اور بھکاری نہیں ہیں
تیرے ہندوستاں کے بہادر سپاہی ہیں جو
انقلاب اور بغاوت کی پگھلی ہوئی آگ میں جل چکے ہیں

ننگی تلواروں کی دھار پر چل چکے ہیں
یہ تری مملکت کے طرفدار ہیں
تیری قسمت کے معمار ہیں
تیری آزادی کے پاسباں ہیں
یہ انھیں کی رگوں کا لہو ہے
ان کے سینے کا خوں ہے
تیرے ماتھے پہ جو آج رنگ شفق
اور ہتھیلی پہ رنگ حنا بن گیا ہے

(۳)

جاگ ہندوستان اپنے خواب گراں سے
دیکھ آزادی کی صبح کا نور پھیلا ہوا ہے
تیرے برسوں کے بچھڑے ہوئے لال گھر آرہے ہیں
یہ غلامی کی زنجیر کو توڑ آئے
قید خانوں کے در کھول آئے
اپنی آغوش میں ان کو بڑھ کر اٹھا لے
اپنے دل میں بٹھا لے

یہ ہمالہ ہے، یہ وندھیاچل ہے، یہ نیلگیری
یہ تیرے کھیت ہیں، تیرے کھلیان ہیں
تیری کانیں ہیں یہ، باغ ہیں، یہ تیرے کارخانے
یہ تیرے سبز و شاداب میدان یہ ہنستی ہوئی وادیاں ہیں
یہ تیری صاف و شفاف بہتی ہوئی ندیاں
تیری گودوں کی پالی ہوئی بیٹیاں ہیں
ان کو اپنے گلے سے لگا لے
اپنے پاکیزہ آنچل کے نیچے چھپا لے

دیکھ یہ اپنے خونیں کفن میں
تیرے لاکھوں شہیدوں کی روحیں کھڑی ہیں
جو تجھے تہنیت دے رہی ہیں
ان کی آنکھیں مسرت کے اشکوں سے نمناک ہیں
لیکن ان کے گریباں ابھی چاک ہیں
ان کو اپنی محبت سے سی دے
پرچموں سے کہو کھل کے انگڑائیاں لیں
فوجیں اپنی شکستہ صفوں کو جمائیں

فتح اور کامرانی کے ڈنکے بجائیں
توپیں جمہوریت کی سلامی اتاریں
اور طیاروں کو حکم دو
آسمانوں پہ جھپٹیں
اپنے مضبوط فولاد کے شہپروں کو ذرا آزمائیں
چاند تاروں کو آکاش سے توڑ لائیں
کشتیاں اپنے لپٹے ہوئے بادباں کھول دیں
اور جہاز اپنے لنگر اٹھائیں
سینۂ بحر سے شاہی جھنڈے ہٹا کر
اپنے جمہوری اور اشتراکی پھریرے اڑائیں

بچّے گہواروں میں کھلکھلا کر ہنسیں
مائیں اشکوں میں بھیگے ہوئے آنچلوں کو سکھائیں
دیویاں مانگ میں اپنی سیندور بھریں
بیبیاں اپنے ماتھوں پہ افشاں لگائیں
ناچیں ناچیں اجنتا کی شہزادیاں
اور ایلورا کی پریاں

اپنی صدیوں کی خاموشی کو توڑ کر گیت گائیں

کیتکی اور چمپا کی کلیاں
اپنی خوشبو بکھیریں
اور ہمالہ کی جھیلوں میں ہنستے ہوئے سرخ ودلکش کنول
اپنی نازک ہتھیلی پر رنگین شمعیں جلائیں
وادیاں مسکرائیں
کھیتیاں لہلہائیں
کوہسار اپنے سینوں کی دولت نکالیں
آبشار اپنی قوت دکھائیں
کانیں اپنے خزانوں کے در کھول دیں
اور ہندوستاں کے قدم پر
اپنے لعل وجواہر نچھاور کریں
آہنی کارخانوں سے کہہ دو
اپنے پہیوں کی رفتار کچھ تیز کر دیں
اور نغموں کے طوفان اٹھائیں

(۴)

آسماں پر چمکتے ہوئے صبح آزادی کے سرخ سورج
تو ہمیں دور سے کس لئے دیکھتا ہے؟
آ ہماری زمین پر اتر آ

تیرے سینے میں وہ روشنی اور حرارت نہیں ہے
جو ہمارے دلوں میں
تیرے ماتھے پہ رنگ شفق ہے
اور ہماری جبیں پر ہمارے شہیدوں کا خوں ہے
روشنی تیری کرنوں کی سطح زمیں تک
اور ہماری نگاہوں سے دل کے کنول جل رہے ہیں
تو فقط صبح نو کا پیمبر ہے
ہم نئے عہد کے ترجمان ہیں

اپنے آکاش کے اونچے آسن پر بیٹھے ہوئے دیوتا
تو کروڑوں برس سے
اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے

ایک ہی راہ پر صُبح سے شام تک
شام سے صُبح تک چل رہا ہے
آ ہماری زمین پر اتر آ
ہم ترے دل کو انسان کی روح کا سوز دے دیں

اے ہزاروں برس کے تھکے ماندے بوڑھے مسافر
آ ہماری زمین پر اتر آ
دو گھڑی ہنس کے سبزہ زاروں میں آرام کر لے
اپنی جھولی کو پھولوں سے بھر لے
اور اپنے سفر پر چلا جا۔

فیض

۱۵ر اگست اور اس کے بعد

ناگہاں شور ہوا
لو شبِ تارِ غلامی کی سحر آپہونچی
انگلیاں جاگ اٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کِھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہزن ہار گئے

راہرو جیت گئے

قافلے دور تھے منزل سے، بہت دور، مگر
خود غرضی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے
چن لیا راہ کے روڑوں کو خذف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہزن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں

ہمنشیں یہ تھا فرنگی کی فراست کا طلسم
رہبر قوم کی ناکارہ قیادت کا فریب
ہم نے آزردگیٔ شوق کو منزل جانا
اپنی ہی گردِ سرِ راہ کو محمل جانا
گردشِ حلقۂ گرداب کو ساحل جانا

اب جِدھر دیکھو اُدھر موت ہی منڈلاتی ہے
در و دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے
خواب زخمی ہیں، اُمنگوں کے کلیجے چھلنی

میرے دامن میں ہیں زخموں کے دہکتے ہوئے پھول
خون میں لتھڑے ہوئے پھول
میں جنھیں کوچہ و بازار سے چن لایا ہوں
قوم کے راہبرو، راہزنو
اپنے ایوانِ حکومت میں سجالو ان کو
اپنے گلدانِ سیاست میں لگالو ان کو

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی
تم نے فردوس کے بدلے ہیں جہنم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
چند سکّوں کے عوض چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموسِ شہیدانِ وطن بیچ دیا
باغباں بن کے اٹھے اور چمن بیچ دیا

۲

کون آزاد ہوا ؟

کس کے ماتھے سے سیاہی چھوٹی ؟
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادرِ ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی

خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لئے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گذرنے کے لئے

چور بازاروں میں بدشکل چڑیلوں کی طرح
قیمتیں کالی دکانوں پہ کھڑی رہتی ہیں
ہر خریدار کی جیبوں کو کترنے کے لئے

کارخانوں پہ لگا رہتا ہے
سانس لیتی ہوئی لاشوں کا ہجوم
بیچ میں اُن کے پھرا کرتی ہے بیکاری بھی
اپنا خونخوار دہن کھولے ہوئے

اور سونے کے چمکتے سکے

ڈنک اٹھائے ہوئے پھن پھیلائے
رُوح اور دِل پہ چلا کرتے ہیں
مُلک اور قوم کو دن رات ڈسا کرتے ہیں

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمایہ کے دلالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

بالیاں دھان کی گیہوں کے سُنہرے خوشے
مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح
اجنبی دیس کے بازاروں میں بک جاتے ہیں
اور بدبخت کسانوں کی بلکتی ہوئی رُوح
اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

ہم کہاں جائیں، کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم
کس کو سمجھائیں، غلامی کے گنہگار ہیں ہم

طوق خود ہم نے پہنا رکھا ہے ارمانوں کو
اپنے سینے میں جکڑ رکھا ہے طوفانوں کو

اب بھی زندانِ غلامی سے نکل سکتے ہیں
اپنی تقدیر کو ہم آپ بدل سکتے ہیں

۳

آج پھر ہوتی ہیں زخموں سے زبانیں پیدا
تیرہ و تار فضاؤں سے برستا ہے لہو
راہ کی گرد کے نیچے سے ابھرتے ہیں قدم

تارے آکاش پہ کمزور حبابوں کی طرح
شب کے سیلاب سیاہی میں بہے جاتے ہیں
پھوٹنے والی ہے مزدور کے ماتھے سے کرن
سُرخ پرچم اُفقِ صبح پہ لہراتے ہیں

آنسوؤں کے چراغ

ہندستان کے شرنارتھیوں، اور
پاکستان کے مہاجرین کے نام

۱

میں سُن رہا ہوں
وہ سسکیاں جو زمیں کے سینے میں
داغِ غم بن کے رہ گئی ہیں
وہ ہچکیاں جن کے سخت پھندے
رُباب و ربط کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں
وہ آہیں جو ظالموں کے ڈر سے

دلوں میں محبوس ہو گئی ہیں
وہ چیخیں جو مادرِ وطن کی
جراحتوں کے ہجوم میں جا کے کھو گئی ہیں
وہ گیت جو نوحہ و فغاں کے
سیاہ خانوں میں چھپ گئے ہیں
وہ سپنے جو فریب کاری کے سبز باغوں میں سو گئے ہیں
وہ سازشیں جن کا زہر کام و دہن کو بیکار کر چکا ہے.
وہ عہدے جن کا نکیلا نشتر رگوں کے اندر اتر چکا ہے
وہ عہد و پیماں
کہ جن کے حرفوں سے وقت و تاریخ کی جبیں پہ
سیاہ دھبے پڑے ہوئے ہیں

(۲)

نئے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
[illegible] ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
یہ کیا ہوا ایک دم سے محفل میں سارے سازوں کے رنگ بدلے
قدامتوں کے کھنڈر میں ماضی کے بھوت دیوانہ وار ناچے

بہار کے سُرخ آنچلوں سے خزاں کے بیمار رنگ برسے

سحر کی رنگین وادیوں میں سیہ بگولے مچل رہے ہیں
ہزاروں سورج نکل نکل کر گہن کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں
ہرے بھرے کھیت گرم شعلوں کے پیرہن میں دہک رہے ہیں
شگوفے لپٹے ہوئے دھوئیں کے سیہ کفن میں سلگ رہے ہیں
کٹے ہوئے ہاتھ اپنی باہوں سے راہ روکے کھڑے ہوئے ہیں
پھٹے ہوئے آنچلوں کے ٹکڑوں میں عصمتوں کی جوان لاشیں
چھدی ہوئی دھرم اور مذہب کے خنجروں میں دلوں کی قاشیں
کٹی ہوئی چھاتیوں کی نس نس سے دودھ خوں بن کے رس رہا ہے

(۳)

یہ رات ہے کس قدر بھیانک
یہ خواب ہے کس قدر پریشاں
ہزاروں سہمی ہوئی نگاہیں
بلکتی آنکھیں سسکتی پلکیں
اندھیری شب میں

کروڑوں اشکوں کے جھلملاتے چراغ لے کر
ہجوم میں قاتلوں کے انصاف کے فرشتے کو ڈھونڈھتی ہیں

مگر میں یہ پوچھتا ہوں تم سے
شریف بہنو
غیور ماؤ
تمہاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے
یہ آنسوؤں کا وفور کیوں ہے

میں جانتا ہوں
تمہارے سینے میں، دل میں، زخموں میں، کتنے آنسو بھرے ہوئے ہیں
تم ان کی بوندوں سے آسمان و زمیں کا دامن بھگو چکی ہو
تم اس طلاطم میں وندھیا اور ہمالیہ کو ڈبو چکی ہو
مگر یہ خوننابہ بار آنکھوں کی بہتی گنگا
زمیں پہ پھیلے ہوئے لہو کے سیاہ دھبے نہ دھو سکے گی
یہ جھلملاتے ہوئے دئیے ہیں
جو ظلم کے جھکڑوں مصیبت کی آندھیوں میں نہ جل سکیں گے

تم ان کی مدھم سی روشنی میں
حسینِ انصاف کے فرشتے کو کب تلک ڈھونڈھتی رہو گی
کہ وہ بھی اس مستقلِ وطن میں
تمہاری ہی طرح، زخم خوردہ ہے، اور آوارہ پھر رہا ہے

(۴)

یہ کس سے فریاد کر رہی ہو
یہ کس کو آواز دے رہی ہو
تم اپنے زخموں کی راکھیاں لے کے کس کی محفل میں جا رہی ہو

تمہارے یہ راہبر نہیں ہیں
تمہارے یہ دادگر نہیں ہیں
یہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کو
سیاسی پردوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے مداری
سفید ریشم کی ڈوریوں پر نچا رہے ہیں
یہ سامراجی بساطِ شطرنج کے پیادے ہیں جن کو شاطر
ہزار چالوں سے شاہ و فرزیں بنا بنا کر چلا رہے ہیں

یہی تو ہیں وہ جنھوں نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
انھیں نے محفل کے ساز بدلے
انھیں نے سازوں کے راگ بدلے
یہی تو ہیں جو تمہارے اشکوں سے اپنے موتی بنا رہے ہیں
تمہاری عصمت، تمہاری عزت، تمہاری غیرت چرا رہے ہیں

یہ قصر وہ ہے کہ جس کے دیوار و در میں
صدیوں کی لعنتیں بس کے رہ گئی ہیں
یہ تاج وہ ہے کہ جس کی ضو میں
وطن کے چہرے کا رنگ تحلیل ہو گیا ہے
یہ تخت وہ ہے کہ جس کے پائے
ہمارے دل میں گڑے ہوئے ہیں
یہ فرش وہ ہے جہاں فرنگی کے بھوت دن رات چل رہے ہیں
یہاں شہیدوں کا خون چھلکتا ہے موجِ رنگِ شراب بن کر
یہاں بلکتا ہے دردِ دل کا سرود چنگ و رباب بن کر

یہاں امیدوں کے پھول اور آرزو کے غنچے نہ کھل سکیں گے
یہاں تمھیں عدل اور انصاف کے فرشتے نہ مل سکیں گے
یہ ظالموں کا محل ہے، یہ قاتلوں کا مسکن ہے، یہ لٹیروں کی انجمن ہے

(۵)

شریف بہنو، غیور ماؤ
تمھارے بھائی
تمھارے بیٹے
تمھاری فریاد سُن رہے ہیں
ملوں سے، کھیتوں سے، اور کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں
وہ دیکھو ان کے جوان سینوں میں
عدل اور انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے
نگہ میں بجلی چمک رہی ہے
اندھیری شب سے پرے شفق کی سنہری مینا چھلک رہی ہے

وہ اپنے سینے کا سوز لائیں

میں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے
کہ جس کے منحوس دامنوں میں
گناہ پروان چڑھ رہے ہیں

کشاکش

انقلابی صفوں میں مصالحت پسندی کے خلاف احتجاج

میں نے سرمایہ افلاس کے ہنگامے میں !
سینۂ خاک سے اٹھتا ہوا دیکھا ہے دھواں
نعرۂ جنگ ہے، بیداد کی فریاد نہیں
نغمہ سنجانِ گلستاں کے کلیجے کی فغاں

سر پہ تلوار ہے، شہ رگ پہ دھرا ہے نشتر
گیت اس ساز پہ، وہ کون ہے، جو گائے گا

اب تو ممکن نہیں اس تلخ حقیقت سے فرار
قوم کا نام ہے اور راج ہے سرمائے کا

کیسے سمجھاؤں بہاروں کا گلابی جوڑا
آج تک روحِ خزاں زیبِ بدن کر نہ سکی
تشنگی کھیتوں کی شبنم سے بجھی ہے نہ بجھے
چاندنی زخموں میں کافور کبھی بھر نہ سکی

کیسے ممکن ہے کہ سورج کی شعاعوں کی پھوار
شب کے فوارۂ تاریک میں رقصاں ہو گی
خارزاروں کی رگ و پے سے کھلیں گے غنچے
ریگزاروں میں جواں روحِ گلستاں ہو گی

ایٹمی بم سے نہ گیہوں کے پھلیں گے خوشے
ٹینک لائیں گے نہ کھلیان میں کھیتوں سے اناج
پھول برسیں گے نہ تبسّم کے نہ بم باروں سے
قتل و غارت سے بڑھے گا نہ محبت کا رواج

ہڈیاں جلتی ہیں اور خوں کے اُبلتے ہیں کڑھاؤ
ایک آسیب ہے سرمایہ پرستی کا سماج
سر کٹی ہاتھ کٹی، پاؤں کٹی لاشوں سے
زندگی موت کے دربار کو دیتی ہے خراج

کارخانوں کے خُدا ہوں کہ زمیں کے مالک
جرم اور قتل پہ ہے ان کی حکومت کا مدار
یہ مجالس، یہ دفاتر، یہ عدالت گاہیں
ان میں انسان کا قانون سے ہوتا ہے شکار

آستینوں میں پر وہت کے چھپے ہیں خنجر
بُت تو معصوم ہیں، بیٹھے ہیں ستم خانوں میں
دھوم ساقی کی سخاوت کی بہت ہے لیکن
خونِ جمہور ہے، بٹتا ہے جو پیمانوں میں

بانجھ ہیں بانجھ غریبوں کی دعائیں جن کی
کوکھ سے امن کی دیوی تو نہ پیدا ہوگی

ہاں بدلتی ہے فقط جوشِ عمل سے تقدیر
حرّیت جنگ کے میداں میں ہویدا ہوگی

کاٹنا پڑتا ہے تلواروں کو تلواروں سے
اپنی طاقت کو ذرا اور بڑھانا ہوگا
ہے زمانے میں شکستوں ہی شکستوں کا جواب
جبر سے ظلم کی ہستی کو مٹانا ہوگا

موجیں جب بڑھتی ہیں دریاؤں میں طوفاں بدوش
اپنے ہر لوچ کو شمشیر بنا لیتی ہیں
جب اترتی ہیں فضاؤں سے زمیں پر کرنیں
سرخ نیزوں پہ اندھیرے کو اٹھا لیتی ہیں

غزل

سکوں میسر جو ہو تو کیونکر، ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظامِ دار و رسن وہی ہے

فریب یہ دے دیا ہے کس نے کہ حریت کی برات آئی
ذرا سی چلمن اٹھا کے دیکھو تو ساحرِ سحر فن وہی ہے

ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمۂ قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے، نوائے سازِ کہن وہی ہے

ابھی تو دیوار و در پہ منڈلا رہے ہیں بیکاریوں کے سائے
ملوں کے اعصاب کا تشنج وہی رگوں کی تھکن وہی ہے

وہی ہے سرمایہ دار و مزدور کی کشاکش جو کل تلک تھی
لہو میں بھیگا ہوا زمانے کے جسم پر پیرہن وہی ہے

سماج کے رُخ پہ ہے غریبوں کے خونِ ناحق کا گرم غازہ
ہیں جس میں پیچیدہ مار و کژدم یہ زلفِ عنبر شکن وہی ہے

لبوں پہ مہریں لگی ہوئی ہیں، زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آدابِ محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

بجھا رہا ہے زمانہ پیاس اپنی علم و حکمت کے میکدوں سے
ہماری محفل میں وہمِ شیخ و جہالتِ برہمن وہی ہے

جنھیں ہم اپنا سمجھ رہے تھے وہ آج بیگانے ہو گئے ہیں
جو غیر کے ابروؤں پہ کل تھی جبیں پہ ان کے شکن وہی ہے

ابھی تو خاشاک کے لئے ہے ہزار طوفان کی ضرورت
اٹھی تھی جو پیچ و تاب کھاتی یہ موجِ گنگ و جمن وہی ہے

بلند محلوں کے بام و گنبد پہ چھوئی کرنوں کو ناچنے دو
جو کالی کٹیاؤں کو اجالا عطا کرے گی کرن وہی ہے

تلنگانہ

تلنگانہ کے چالیس لاکھ کسانوں کے نام جو آج مسلح
بغاوت کر رہے ہیں

۱

تیز ہے وقت کی نبضوں میں لہو کی گردش
زلزلہ خیز ہے بپھرے ہوئے تاروں کا خرام
دھڑکنیں دل کی بجاتی ہیں دہل سینے میں
ہاتھ لہراتے ہیں سرمست پھریروں کی طرح

سیکڑوں سال کے لب بستہ دہن کھلتے ہیں
جوشِ گفتار میں پگھلے ہوئے لاوے کا ابال
کتنا بیباک ہے صدیوں کی خموشی کا خروش
آج فریاد میں تاثیر ہے للکاروں کی
آج ہر سانس میں جھنکار ہے تلواروں کی

تہلکہ رات کی سرحد پہ مچا رکھا ہے
لشکرِ صبح میں شب خوں کی تیاری ہے
یہ اُبلتے ہوئے نعرے ہیں کہ سیلابِ عظیم
جو در و بام سے ایوانوں کے ٹکراتے ہیں
خس و خاشاک بہا جاتا ہے جاگیروں کا

آہنی قدموں کی آہٹ سے دہلتی ہے زمیں
اُن کی رفتار کو دیتے ہیں بگولے بھی خراج
بجلیاں نقشِ قدم چوم کے رہ جاتی ہیں

۲

یہ مجاہد، یہ بہادر، یہ جیالے، یہ کسان
برق و باراں کے حریف
جن کے چہروں پہ ہے دھرتی کا سکوں اور وقار
اور ہتھیلی میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
کیاریاں بوتے تھے اشکوں کی، لہو کاٹتے تھے
آج ہر کھیت میں ہر دشت میں ہر میدان میں
اپنے سینے سے چھڑکتے ہیں لہو کے قطرے
بجلیاں کھلتی ہیں، گل کھلتے ہیں بم اگتے ہیں

بوڑھے ہونٹوں سے جوانوں کو دعا ملتی ہے
انگلیاں پیار سے بندوقوں کو سہلاتی ہیں
گھر میں ڈھالے ہوئے بم گولوں کی پیشانی کو
عورتیں پھولوں سے صندل سے سجا دیتی ہیں
مائیں بچوں سے یہ کہتی ہیں کہ اکرام کرو
دیوتا آئے ہیں پرنام کرو

رات دن گاؤں میں، کھیتوں میں، بیابانوں میں
دیوتاؤں کا نکلتا ہے جلوس
نوجواں ہنستے ہوئے گاتے ہوئے
موت سے لڑنے کو میداں میں چلے جاتے ہیں
اور بغاوت سے سلگتی ہوئی دوشیزائیں
صندلی ہاتھوں میں شربت کے کٹورے لے کر
اپنا دل اپنی نگاہوں میں اٹھا لاتی ہیں

نیند آنکھوں کی چرا لیتے ہیں ہتھیاروں کے خواب

کھیتیاں خوش ہیں کہ اب ان کی بہاروں کی خزاں
چھد کے رہ جائے گی جمہور کی سنگینوں میں
راہیں رقصاں ہیں کہ ذروں کے دھڑکتے ہوئے دل
ظلم کی فوج کے قدموں سے نہ زخمی ہوں گے
پانی ہنستا ہے کہ اب اس کا چھلکتا ہوا خون
کھیت سینچے گا نہ بدکار زمینداروں کے

گنگناتی ہیں ہوائیں کہ کلیجے ان کے
دُکھ بھری چیخوں کے نشتر سے نہ چھلنی ہوں گے
قہقہے ٹوٹے ہوئے سازوں کو کرتے ہیں درست
صُبحیں خوش رنگ ہیں شاموں کی جبیں ہے روشن
رات کی گود میں جلتے ہیں بغاوت کے الاؤ
ڈالیاں کرتی ہیں تیار شگوفوں کا لباس
فتح کے جشن منانے کے لئے

اب یہ ٹوٹے ہوئے، ٹھٹھرے ہوئے، جکڑے ہوئے ہاتھ
بڑھ کے محلوں کو اٹھا لیں گے کھلونوں کی طرح

خواب کے سامنے تعبیر کا آئینہ ہے

۳

میں بہت دور سہی تجھ سے پرے اے ارضِ وطن
تیرے جذبات و خیالات سے نزدیک ہوں میں

مرے سینے میں ترے نقشِ قدم روشن ہیں
تیرے بچوں نے مری گود میں بوئے ہیں جو بیج
وہ مرے نغمہ و اشعار میں پھل آئے ہیں

ان دنوں تیرا تصور ہی ہے ہمدم میرا

بہنیں جب آتی ہیں کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے لاش
گود میں جنگ کے ٹوٹے ہوئے ہتھیار لئے
بھر کے چلّو میں شہیدوں کے لہو کی بوندیں
وہ مری روح کے چہرے پہ چھڑک دیتی ہیں
اور مرے سینے میں اک آگ سی لگ جاتی ہے
میرا ہر قطرۂ خوں مجھ سے یہ کرتا ہے سوال

بولو ہم جنگ کے میدان میں کب اتریں گے؟
اس بغاوت کی حسیں راہ سے کب گذریں گے؟

غزل

تری ادائیں ہیں ساحرانہ، نہ تیرے انداز دلربانہ
تو ہی بتادے کہاں سے آئیں گے مجھ کو آدابِ عاشقانہ

حقیر ہو کر نہ رہ سکے گی تری بلندی سے میری پستی
میں اپنے سجدوں سے کیوں بساؤں تری رعونت کا آستانہ

مرے لئے ایک سے ہیں دونوں وہ کوئی صیاد ہو کہ گل چیں
نظامِ گلشن میں شاخِ گل سے الگ نہیں شاخِ آشیانہ

فریبِ دیگر حیاتِ نو کا حیات ہی چھین لی ہے ہم سے
ہم اس زمانے کا کیا کریں گے اگر یہی ہے نیا زمانہ

خلیق بھی ہے، شفیق بھی ہے، کسی کو کوئی گلا نہ ہوتا
بس اک شکایت یہ ہے کہ پیرِ مغاں کی فطرت ہے تاجرانہ

غزل

امتحاں ہم وطنی میں ہے وفاداری کا
اہرمن تخت نشیں ہے، اسے یزداں کہیے

کیجیے روح کو تیار غلامی کے لئے
شوقِ آزادیٔ انساں کو گریزاں کہیے

کسی بھوکے کو کبھی بھوکا نہ سمجھے ہرگز
کوئی عُریاں نظر آئے تو نہ عُریاں کہیے

یہ نہ کہیے کہ حکومت ہے مصائب کا سبب
گردشِ چرخِ کہن، گردشِ دوراں کہیے

کیجیے شاعری اس طرح کہ سمجھے نہ کوئی
ظلم اور جور کو بھی نازِ حسیناں کہیے
کوئی بھی بات سمجھنے کی نہ زحمت کیجیے
قلب اور ذہن کو آئینہ حیراں کہیے
کھینچ لیجیے رگِ الفاظ سے خونِ معنیٰ
رقصِ بسمل کی جگہ رقصِ غزالاں کہیے
ہر درندے کو پنہا دیجیے انساں کا لباس
اور جی کھول کے انسان کو حیواں کہیے
رات دن کیجیے سرکار کی چوکھٹ کا طواف
اور اسے حاصلِ جاں حاصلِ ایماں کہیے
شبِ تاریک کو سینے سے لگا کر رکھیے
اور اسے چشمۂ خورشیدِ درخشاں کہیے
دیجیے خاکِ وطن سے یہ محبت کا ثبوت
کہ خس و خار کو بھی رشکِ گلستاں کہیے
کیجیے کوچہ و بازار میں لاشوں کا شمار
اور پھر ہند کو فردوس بداماں کہیے

سیکھیے ساز پہ آہوں کے غزلخواں ہونا
جھلملاتے ہوئے اشکوں کو چراغاں کہیے

زہر کے جام کو نوشینہ سمجھ کر پیجیے
دل میں اُترے ہوئے نشتر کو رگِ جاں کہیے

اپنے ہر زخم کو اک پھول تصوّر کیجیے
سُرخیٔ خونِ عزیزاں کو بہاراں کہیے

چارہ گر جانیے اس دور میں ہر قاتل کو
زندگی موت کو، اور درد کو درماں کہیے

تن سے چھن جائے تو رہزن کو دعائیں دیجیے
چاک ہو جائے تو دامن کو گریباں کہیے

خاک پر سویے آکاش کے سائے کے تلے
بسترِ مخمل و کمخواب و شبستاں کہیے

دخترِ دشمنِ ناپاک کو دیجئے بوسہ
اور اسے قیمتِ ناموسِ شہیداں کہئے

مختصر یہ ہے کہ اب سانس بھی لینا ہے حرام
تا کجا قصۂ احوالِ پریشاں کہئے

لطف تو جب ہے کہ دل دار و رسن سے کھیلے
اور اس شغل کو بازیچۂ طفلاں کہئے

۲۵ ستمبر ۴۸ء

سیلابِ چین

انقلاب اب کہاں ہے ؟
کون سی وادیوں
کونسی منزلوں ہیں
مرے شوق کا کارواں ہے ؟
روس بھی سُرخ رو اور یورپ کا مشرق بھی گلنار ہے
ہم بھی اس جانِ عصرِ رواں کے لئے
اپنی آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں
اپنے زخموں کی پوشاک پہنے کھڑے ہیں
اپنے خوابوں کی شمعیں جلائے ہوئے ہیں

میں نے تاریک راتوں کے روشن ستاروں سے پوچھا
برق رفتار لمحوں کے اڑتے شراروں سے پوچھا
انقلاب اب کہاں ہے ؟
آفتاب اب کہاں ہے ؟

"چین میں"
کوہساروں سے آواز آئی
مرغزاروں
گرجتے ہوئے آبشاروں
دہکتے ہوئے لالہ زاروں سے آواز آئی

"چین میں، چین میں"
وادیاں گونج اٹھیں
کوہ کی چوٹیاں گونج اٹھیں
ندیاں چین کا نام لیکر سمندر میں دوڑیں
چین کا نام لے کر سمندر سے کالی گھٹائیں اٹھیں
شرق اور غرب میں
چین کا نام بارش کے قطروں کی صورت میں ٹپکا
پیاسی دھرتی نے اس نام سے اپنے لب تر کئے

اور کسانوں نے کھیتوں کو سینچا
کونپلیں نرم مٹی سے اس نام کو اپنے دل میں چھپا کر اُگیں
اور یہ نام سو پھول بن کر کھلا
شہد اور عطر اور رنگ بن کر زمانے میں پھیلا
ہواؤں میں لہرایا
شعلوں میں لپکا
اور اک آتشیں داستاں بن گیا
پاک اور صاف کاغذ نے اس نام کو اپنے دل پر لکھا
پرچموں نے اسے اپنی پیشانیوں پر سجایا
اور سازوں نے گایا

اب ہوا
چین کے نام کو گنگناتی ہے
اور اب فضا
چین کے نام پر مسکراتی ہے
اور کرۂ ارض کے شاعروں کے لئے
چین سب سے بڑا گیت، سب سے حسین نظم ہے
چین ایک حوصلہ، اک امنگ اور اک عزم ہے

چین اک وحی ہے، ایک اُپدیش ہے، ایک پیغام
ایشیا کے لئے ایک انعام ہے

چین کیا چیز ہے بیزاروں سے پوچھو
چین کیا چیز ہے غم کے ماروں سے پوچھو
چین بھوکوں کی روٹی ہے
ننگوں کا کپڑا ہے
بے گھر کا گھر ہے
چین مفلس کے زخموں کا مرہم
امیروں کا زخم جگر ہے
چین لاکھوں کروڑوں غلاموں کی آزادی
اور قیدیوں کی رہائی کا اعلان ہے
چین سرمایہ داری کی جلتی ہوئی دھوپ میں
اک گھنے پیڑ کی چھاؤں ہے
چین چرچل، پٹیل، اور نہرو، ٹرومین اور مارشل کے لئے
چیانگ اور چیانگ کی طرح کے ڈاکوؤں کی سیہ کاریوں کے لئے
زہر اور موت کا جام ہے

چین انسانیت کا نیا نام ہے
اس لئے میں
کہ انسانیت کا مغنی ہوں
اس آتشیں راگ سے
اپنے بربط کو شعلہ فشاں کر رہا ہوں
چین اے ہند کے ہمنشیں،
ماؤزے تنگ کی سرزمیں،
لوہوسن کے وطن
اپنے گمبھیر سنگیت کی ایک ہلکی سی لے
ایک مدھم سی تان
اپنے طوفان کی ایک دو بجلیاں
اپنے جوالا مکھی کے خزانے کی دو چار چنگاریاں
میرے سینے میں بھر دے
اپنے شاعر کو سیراب کر دے
تاکہ میں تیری ہمت کی یہ داستاں اسطرح کہہ سکوں
جیسے بندوق کی باڑھ چلتی ہے
بارود جلتی ہے

جو الاکھی پھوٹتا ہے

۲

چین اک ملک تھا
بادشاہوں، غلاموں، کنیزوں، کسانوں کا اک دیس تھا
جس کے میدان قحط اور وباؤں سے آباد تھے
جس کے دریاؤں میں زرد سیلاب بہتے تھے
اور نیلے آکاش پر
بادلوں کی طرح ٹڈیاں اڑ رہی تھیں

چین اک سن رسیدہ گنہگار تھا
جس کے پیروں میں زنجیر، گردن میں طوق گراں تھا
جس کے سینے میں دل کی جگہ اک بڑا زخم تھا
ایک ناسور تھا
اور رگوں میں لہو کی جگہ صرف آنسو بھرے تھے
چین اک داشتہ، اک کنیز، ایک دوشیزہ کا نام تھا
جو ہزاروں برس سے برہنہ

زمانے کے بازار میں بک رہی تھی
جس کے رخسار خوف اور دہشت کے دو تمتمائے ہوئے پھول تھے
اور آنکھوں کی یخ بستہ جھیلوں میں غم جم گیا تھا
جس کے ٹھٹھرے ہوئے پیر میلی روایات کی بیڑیوں میں بندھے تھے

چین ایک بوڑھی ماں تھی
چیانگ نے جس کو بدکار جاپانیوں کی ہوس اور زنا کے لئے دے دیا تھا

چین ایک لاش تھی
جس پہ انگریز، امریکی اور دوسرے سامراجی
گدھوں کی طرح سالہا سال منڈلائے ہیں
بوٹیاں جس کی سرمایہ داروں میں تقسیم ہوتی رہی ہیں
چین ظالم زمیندار اور جنگجو ڈاکوؤں کا وطن تھا
اپنے کاغذ کے پھولوں
چائے کی پیالیوں
اور افیون کی گولیوں کے لئے
ساری دنیا میں مشہور تھا

رحم اور بھیک، صبر اور قناعت کا بے جان پیکر تھا جس سے
حکمراں، مذہبی پیشوا، سامراجی لٹیرے
جونک کی طرح چپٹے ہوئے تھے

کل تلک چین اک شمع بے نور تھا
نغمۂ بے صدا تھا
ایک بے رنگ تصویر، اک بے اثر بد دعا تھا
اور اب چین اک کارخانہ ہے جس میں
بجلیاں بن رہی ہیں
اور بم ڈھل رہے ہیں
جس کے کھیتوں میں دل اُگ رہے ہیں
جس کی شاخوں میں گیہوں کے خوشے لگے ہیں
دھان کی بالیاں پھل رہی ہیں

۳

ماؤزے تنگ کی فوج کتنی حسیں فوج ہے
ارتقا اور انسانیت کے سمندر کی اک موج ہے

جو کونٹانگ کے ریگ زاروں کو غرقاب کرنے کو بیتاب ہے

اس میں مزدور ہیں
اس میں دہقان ہیں
اس میں جتنے سپاہی ہیں سب صرف انسان ہیں
اس میں رستے ہوئے زخم ہیں
درد کی ٹیسیں
آہوں کی بپھری ہوئی آندھیاں
آنسوؤں کے اُمنڈتے ہوئے گرم طوفان
ماؤں کی گائی ہوئی لوریاں

اور محبت کی سرگوشیاں
ننھے معصوم بچوں کی کلکاریاں
نوجوانی کے خواب
آرزوؤں کی تعبیریں
کھیتوں کی ہریالیاں

ندیوں کی روانی
لہکتے ہوئے سبز میدان کی وسعتیں

ریل کی پٹریاں
کارخانوں کے سرکش ہتھوڑے
مشینوں کے دل
اور کسانوں کے بھاری ہلوں کی چمکتی ہوئی تیز پھالیں
کدالوں کا فولاد
بندوق کی گولیاں
گوپھنیں، پھاوڑے، رسیاں، لاٹھیاں
چاولوں کی مہک، دھان کی بالیاں
اور لکڑی کے ٹوٹے کھلونے
اور اس فوج کے سامنے
چیانگ کے ٹینک بیکار
فاشزم کے سارے بمبار بیکار ہیں
یہ اندھیرے کے ڈیرے پہ دلکش اجالے کی یلغار ہے
نفرتوں سے محبت کی پیکار ہے
موت پر زندگانی کا اک آخری وار ہے
سُرخ لشکر کے جرار دستوں کی یورش نہیں
بلکہ جنبش میں اب چین کی اونچی دیوار ہے

کس کی ہمت ہے جو اس کو ڈھائے
کس کی ہمت ہے جو اس کو پیچھے ہٹائے
اب یہ دیوار بڑھتی چلی جائے گی
ایک طوفان کی طرح چڑھتی چلی جائے گی

ماوزے تنگ کی فوج اک خوں کا سیلاب ہے
اس میں ملبار کا اور تلنگانے کا خون ہے
شعر کا اور افسانے کا خون ہے
اس میں کشمیر کا اور امل نیر کا خون ہے
اس میں اسپین و یونان کا خون ہے
اس میں انسان کا خون ہے
جو بہایا گیا ہے
اور چوسا گیا ہے
جس سے سرمایہ داری کو جاگیرداری کو سینچا گیا ہے
کس کی ہمت ہے جو اس کی یورش کو روکے
کس کی ہمت ہے جو اسکو ٹوکے

اب یہ سیلاب بڑھتا چلا جائے گا
چین کی سرزمین سے ملایا تلک
اور ملایا سے برما تلک
اور برما سے ہندوستان
اور ہندوستان سے فلسطین و یونان و اسپین تک
اب یہ طوفان چڑھتا چلا جائے گا
چین کے سرکشو، چین کے باغیو، مرحبا
اور آگے بڑھو، اور آگے بڑھو
وار پر وار کرتے چلو
دشت و کہسار کو اپنے دامن میں بھرتے چلو
موت اور خون کو فتح کرتے چلو
چین کی سرزمین
ایک قالین کی طرح قدموں کے نیچے بچھی ہے
شہر اور گاؤں شربت کے لبریز پیالے ہیں
جو وادیوں اور میدانوں کی
کشتیوں میں سجائے گئے ہیں
ایک اک کر کے ان کو اٹھا لو

اپنی صدیوں کی پیاس اب بجھالو

ساتھیو آج تم جنگ اور امن کے آخری کھیل میں
امن کے پاسباں ہو
ساری دنیا کی نظریں تمھیں پر لگی ہیں

دور تم سے بہت دور بنگال کے ایک گمنام سے گاؤں میں
ایک ماں ہے
اس کے آنچل میں اک لال ہے
جو ٹمک کر تمھیں دیکھتا ہے

اور پیرس کے باغات کے ایک حسیں کنج میں
دو دھڑکتے ہوئے دل تمہاری
فتح کے منتظر ہیں

اور افریقہ کے جنگلوں کی گھنی چھاؤں میں
اک حبشی حسینہ

اپنے محبوب کی یاد میں گا رہی ہے

اور اسپین میں
ایک دہقان زیتون کے باغ میں سو رہا ہے

اور جوہو پہ نیلے سمندر کی موجیں
اپنے چاندی کے پانی سے ساحل کا منہ دھو رہی ہیں

ساتھیو آج یہ سب تمہارے طرفدار ہیں
سب تمہارے مددگار ہیں
سب تمہارے لئے لڑ رہے ہیں
اور میں گا رہا ہوں
اور مرے ساتھ نیرودا، چلی کا جواں سال شاعر ہے
پیرس کا آتش نفس آراگوں ہے
سوویت یونین کا جوالا مکھی مایا کاوسکی ہے
لورکا، والٹ وہٹ مین،
گورکی اور پشکین

دانتے اور ہومر

سب ہم آواز ہیں
رات کی آبنوسی ہتھیلی پہ تاروں کے روشن کنول ہیں
صبح کے ہاتھ میں سرخ سورج کا آئینہ ہے
شوخ پھولوں کے سینے میں شبنم کے موتی بھرے ہیں
اور تمہاری دہکتی ہوئی انگلیاں
رائفل اور بندوق تھامے ہوئے ہیں
جن کی آواز میں امن کا گیت
آدمیت کا سنگیت ہے۔

جیل

تیرگی رستی ہے
جیسے زخموں سے سیہ خون کی بوندیں ٹپکیں
خامشی چلتی ہے
چیونٹیاں جیسے بدن پر رینگیں
قید میں چلتے ہوئے سایوں کو
اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کی اندھی دیوار
ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھتی ہے
درد کی طرح سے اٹھتی ہیں امنگیں دل میں

ٹیس کی طرح سے بھولی ہوئی یاد آتی ہے
جیل کی خاک سے آہوں کا دھواں اٹھتا ہے
اور لوہے کی سلاخوں میں بدل جاتا ہے
بیڑیاں روتی ہیں، زنجیریں فغاں کرتی ہیں
کوڑے چیخ اٹھتے ہیں جلّادوں کی خونخواری پر
کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ تشدّد کا نظام
آج اہنسا کے پجاری ہیں محافظ جس کے
دھارے اس وادیٔ خاموش میں تھم جاتے ہیں
آنسو آنکھوں سے ٹپکتے نہیں جم جاتے ہیں
نالے بے سود ہیں بیکار ہے فریاد یہاں
ہم ہیں صید اور ہر اک ذرّہ ہے صیّاد یہاں
اپنے ہاتھوں سے تشدد کو مٹانا ہوگا
آہن و سنگ کی دیوار کو ڈھانا ہوگا

جشنِ بغاوت

ساتھیو لال سلام
آج ٹکراتے ہیں ایوانِ حکومت سے عوام
آج آقاؤں کی گردن پہ جھپٹتے ہیں غلام
آج ہے خاک بسر ظلم و تشدّد کا نظام
آج شاعر کی زباں پر ہے بغاوت کا پیام
ساتھیو لال سلام
آج ہر گام پہ سو سُرخ علم لہراؤ
گاؤ انسان و لینن کے ترانے گاؤ

اک ایڑ اور بھی رہوارِ بغاوت کو لگاؤ
لکھ دو پیشانیٔ تاریخ پہ مزدور کا نام
ساتھیو لال سلام

وادیٔ سنگ سے نکلا ہے شراروں کا جلوس
شب کی راہوں سے گذرتا ہے ستاروں کا جلوس
چین کے سرخ اُفق پر ہے بہاروں کا جلوس
ماؤں کے ہاتھ میں آزادیٔ انسان کا جام
ساتھیو لال سلام

آسمانوں کو ہلاتا ہے زمیں کا بھونچال
ناچتی پھرتی ہے ویران ملوں میں ہڑتال
موجیں دیتی ہیں گرجتے ہوئے طوفان کو تال
ڈھل گیا وقت کی رفتار میں بجلی کا خرام
ساتھیو لال سلام

بجھ گئی سینۂ انجن میں دہکتی ہوئی آگ
سو گئے چین سے شعلوں کے لپکتے ہوئے ناگ
بھاپ گاتی نہیں اب تیزیٔ رفتار کے راگ
پٹریاں میٹھی ہیں لوہے کا بچھائے ہوئے دام

ساتھیو لال سلام

ڈوبتی رات کے تاروں کو کفن پہنا دو
مارشل چیانگ کے پیاروں کو کفن پہنا دو
ہند کے راج دلاروں کو کفن پہنا دو
گھر میں سرمایہ کے مدت سے مچا ہے کہرام

ساتھیو لال سلام

پھونک دو کالے فرنگی کے صنم خانے کو
کھود کر گاڑ دو بر دولی کے افسانے کو
آج جاتی ہے ہر اک راہ تلنگانے کو
قافلے کر نہیں سکتے کسی منزل پہ قیام

ساتھیو لال سلام

رومان سے انقلاب تک

پندرہ برس کی ترقی پسند شاعری پر تنقید

ساتھیو اب میری انگلیاں تھک چکی ہیں
اور مرے ہونٹ دکھنے لگے ہیں
آج میں اپنے بے جان گیتوں سے شرما رہا ہوں
میرے ہاتھوں سے میرا قلم چھین لو
اور مجھے ایک بندوق دیدو
تاکہ میں اپنے نغموں میں فولاد و بارود کا زور بھر دوں

میں تمہاری صفوں میں تمہاری طرح
اپنے دشمن سے لڑنے چلوں گا
میں تمہارے نفس کی حرارت
تمہارے لہو کی روانی
تمہارے دلوں کی تڑپ چاہتا ہوں

میں ادب کی بلندی سے واقف ہوں مجھ کو
شعر کی قوتوں کا بھی احساس ہے
جن سے ریگِ بیاباں میں طوفاں اٹھے ہیں
لیکن اب مجھکو اس دور کے
سارے اشعار بے کیف سے لگ رہے ہیں
وہ مرے اپنے اشعار ہوں یا کسی اور کے
ان میں تلوار کی دھار، بجلی کی تیزی نہیں ہے
صرف اشکوں کے طوفان، خوابوں کے رومان ہیں
خوں کی گرمی نہیں ہے

میں نے ہر طرح کے گیت گائے

میں نے ہر رنگ کے پھول برسائے لیکن
پھول زخموں میں اور گیت فریاد میں کھو گئے

میں نے زخموں پہ اشکوں کا مرہم لگایا
میں نے آہیں بھریں
میں نے اپنی امنگوں کی لاشوں پہ ماتم کیا
اپنی مردہ محبت کی قبریں بنائیں
اور انھیں جا کے بازار میں بیچ آیا

میں نے برفاب جسموں کو پگھلا دیا
تھرتھراتے ہوئے نرم آنچل کو سینوں سے ڈھلکا دیا
اور پہلی محبت کے پھولوں سے شبنم کے موتی چنے
اور انھیں
چند کاغذ کے ٹکڑوں میں
کپڑے کی جلدوں میں محفوظ کر کے
کتب خانوں میں رکھ دیا

ان کے اوراق پر تہہ بہ تہہ
ماہ اور سال کی گرد جمتی رہی
اور میں اپنے جذبات کی دھندلی فضاؤں میں کھوتا گیا
زندگانی کی شورش سے کچھ اور بھی دور ہوتا گیا

میں نے دلی میں پنجاب میں اپنے نغموں کی جھولی پساری
اور ایک ایک سے امن کی بھیک مانگی
اُن کو مجھ پر ترس آگیا
(اس سے کیا بحث وہ کون تھے
راہزن۔ تھے کہ جلّاد تھے
پھر بھی انسان تھے
آخرش وہ مرے ہم وطن تھے)
اور انھوں نے مری گود میں
چند جھلسے ہوئے ہاتھ
ٹوٹی ہوئی ہڈیاں
خون میں لتھڑی ہوئی چھاتیاں پھینک دیں

روٹیوں کو کبھی میں نے چاند اور سورج سے تشبیہ دی اور کبھی
رنڈیوں سے
اور وہ چاند سورج کے مانند ہم سے بہت دور نیلی فضاؤں میں
اڑتی رہیں
صرف خوابوں میں صورت دکھاتی رہیں
رنڈیوں کی طرح
نفع خوری کے اونچے جھروکوں میں بیٹھی ہوئی مسکراتی رہیں
آنتیں روتی رہیں پیٹ یوں ہی بلکتے رہے
بھوک کی آگ میں روح اور دل سلگتے رہے

میں نے اپنے تخیل میں خوابوں سے کپڑے بُنے
اور ستاروں سے آنچل بنائے
میں نے ان کارخانوں کے نغمے سنے
جو ابھی صرف میرے تصور میں محبوس ہیں
اور میرا وطن جھینپڑوں ہی میں پڑا رہا

ریت سے میں نے کتنے گھروندے بنائے

اور ہمالہ کی نیلی چٹانوں کے دل کو ٹٹولا
میں نے پتھر کے سینے میں محراب و منیار کا حسن دیکھا
اور مرا ذہن کیا جانے کتنے ستون، کتنے دیوار و در ڈھال لایا
میں نے اپنے وطن کو سجایا
اس کے ایک ایک ذرے کے دل میں اجنتا ایلورا بسایا
پھر بھی میرا وطن آج ویران ہے
اس کے محلوں میں چور اور ڈاکو بسے ہیں
اور انسان سڑکوں پر آوارہ ہیں

اور میں سوچتا ہوں کہ میں کون ہوں
کس کا شاعر ہوں
کس کے لئے گا رہا ہوں

اک طرف اونچے اونچے محل ہیں
اک طرف جھونپڑے ہیں
اک طرف گوشت کے اور چربی کے بورے دھرے ہیں

اک طرف سخت فولاد کے سخت آعصاب ہیں
اک طرف ظلم اور جبر کی قوتیں ہیں
اک طرف عدل و انصاف کا زور ہے
اک طرف ماؤ ہے اک طرف چیانگ ہے
اک طرف مارشل اک طرف مالوتاف
اک طرف کالی فسطائیت اک طرف انقلاب
اک طرف ایلیٹ اک طرف گورکی
اک طرف فصلِ گل اک طرف خارزارِ خزاں
اک طرف عہدِ ماضی کی ویرانیاں
اک طرف آنے والے زمانے کی تعمیر
اک طرف شب کی پرہول پرچھائیں ہے
اک طرف سُرخ سورج کی تنویر ہے
اک طرف موت ہے اک طرف زندگی ہے
اک طرف تیرگی اک طرف روشنی ہے
اک طرف خامشی اک طرف شاعری ہے

شاعر و ساتھیو

وقت نے فیصلہ کردیا ہے
بولو تم آج کس کے طرفدار ہو
کس کے غم خوار ہو
آج بندوق بربط ہے فولاد کی گولیاں راگنی ہیں

شاعرو ساتھیو
اپنے تاریک اندیش رومان کے ساز کو توڑ دو
اپنی مضراب کو پھینک دو
اس کے نغموں سے آنسو ٹپکتے رہیں گے
اپنی شہرت کے اونچے مناروں سے
نیچے اتر آؤ
اپنے کتب خانوں سے
آؤ باہر نکل آؤ
اور زندگانی کی رفتار دیکھو
عہدِ حاضر کے انسان کا جوش دیکھو

شاعرو، ساتھیو

کاکلوں کی گھنی چھاؤں سے
سُرخ پرچم کے سائے میں آؤ
اور نئے گیت گاؤ

گاؤ مزدور کے ساز پہ
گاؤ جمہور کے ساز پہ
آہنی کارروانوں کے قدموں کی آواز پہ
گاؤ جس طرح میداں میں کوئی مجاہد رجز پڑھ رہا ہو
گاؤ جیسے سمندر میں طوفان کا دیوتا چڑھ رہا ہو
گاؤ گاؤ گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح
گاؤ گاؤ کڑکتی ہوئی بجلیوں کی طرح
آندھیوں کی طرح
زلزلوں کی طرح
گولیوں کی طرح اپنے الفاظ دشمن پہ برساؤ
سارے عالم پہ چھا جاؤ

مارچ سنہ ۱۹۴۹ء